معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ سو روپے فی شمارہ دس روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحیٰی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY , AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵% ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۶۹ ماہ صفر المظفر ۱۴۲۳ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۰۲ء عدد ۵

فہرست مضامین

شذرات

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شہرت و مقبولیت عالم گیر تھی، ان کے دور نظامت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کو بھی بڑا اعتبار اور حسن قبول حاصل ہوا، اس نے ہمہ جہتی ترقی کی، گوناگوں علمی، تحقیقی، اصلاحی، دعوتی اور فلاحی شعبے قائم ہوئے، ان شعبوں کی کثرت اور تعمیرات میں اضافوں کے لحاظ سے بعض یونیورسٹیاں بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، مولانا کی وفات کے بعد بھی الحمدللہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں لگا ہوا ہے اور سارے کام جوش و ولولہ سے انجام پارہے ہیں بلکہ اس کے کاموں کا دائرہ مزید وسیع ہورہا ہے اور سرگرمیاں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں، مولانا کے اصل جانشین مولانا سید محمد رابع ندوی نے ان کے سارے کام سنبھال لئے ہیں اور ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے مطابق ندوہ کے مقاصد کو بروئے کار لارہے ہیں، ۲۸/ اپریل کو دارالعلوم کا جلسۂ انتظامیہ تھا، اس میں مولانا کی رپورٹ پڑھ کر اور بچشم خود ندوہ کی موجودہ سرگرمیاں اور کاموں کا پھیلاؤ دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ اس کے فیض کو اور زیادہ عام کرے۔

مولانا سید محمد رابع کی رپورٹ میں عالمی سطح پر دینی مدارس پر منڈلا رہے خطرات کا خاص طور پر ذکر تھا اور جلسے پر بھی مرکزی خیال کی حیثیت سے یہی موضوع چھایا ہوا تھا، اکثر دینی مدارس بھی اس کی وجہ سے بڑی تشویش و اضطراب میں مبتلا رہتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مدارس امت اسلامیہ کی بقائے دینی کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہیں اس لئے ان کو ختم کرنے اور ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے سے نہ صرف مدارس بلکہ پورے مسلم معاشرے کی فضا کا غم ناک اور سوگوار ہونا یقینی ہے جب کہ یہ مدارس بے ضابطہ نہیں بلکہ دستور ہند میں مسلمانوں کو دیے گئے حقوق کے مطابق قائم ہیں اور یہ ملک سے ناخواندگی کو دور کرنے اور تعلیمی بوجھ اٹھانے میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں، انگریزوں نے اپنے دور میں مسلمانوں کے اسلامی تشخص کو ختم کرنے کے لئے انہیں سخت سزائیں دیں تو علماء نے دین کے تحفظ کے لئے مدارس قائم کئے جن کی برکت سے اسلام باقی رہا، مگر آج ان کے خلاف عالمی سطح پر مخالفانہ محاذ بن رہا ہے اور ان کو مشکوک بنانے کی جو کوششیں ہورہی ہیں ان کو دور کرکے مدارس کے تحفظ و بقا کے تمام ممکنہ طریقے اختیار کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مدارس ہی نہیں خود اسلام کے بارے میں بھی غیر مسلموں میں بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، اس کی اصل حقیقت سے ناواقف ہونے ہی کی بنا پر اس کو دہشت گردی اور ظلم و تشدد کا مذہب سمجھا جاتا ہے، بہت سے لوگ تو قصداً اور شرارتاً یا اسلام اور مسلم دشمنی اور مسلمانوں کو تنگ کرنے کے لئے اس طرح کی بے سروپا باتیں کہتے ہیں لیکن ہندوؤں کی اکثریت ناواقفیت اور شرپسندوں کے پروپیگنڈے کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہے اور چونکہ مسلمانوں کی جانب سے ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ خاطر خواہ طور پر نہیں کیا جارہا ہے بلکہ ان کے غلط اور مجرمانہ اعمال و اشغال کو دیکھ کر وہ اسلام کو سراپا عیب خیال کرتے ہیں، اس لئے مسلمانوں کے بعض گروہوں کو موجودہ ذرائع ابلاغ سے کام لے کر ان غلط فہمیوں کے ازالے کے لئے اٹھنا چاہئے، ملک میں نفرت کی بڑھتی ہوئی خلیج اور ہندو مسلم کشمکش اور کشیدگی کو دور کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ اسلام کی اخوت، محبت، رواداری، مساوات، رحمت و برکت، امن و سلامتی اور عدل و انصاف کی تعلیم عام ہو، مسلمان اپنا داعیانہ کردار ادا کرتے ہوئے غیر مسلموں کو بتائیں کہ اسلام تمام انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد، خدا کا کنبہ اور سب کو بھائی بھائی سمجھتا ہے، علماء اور ارباب مدارس کا یہ اولین فریضہ ہے، ان کا یہ کام نہیں ہے کہ سنگ و خشت کا جہاں آباد کرکے اور مسلکی و فروعی اختلافات کھڑے کرکے مسلمانوں کی ہوا خیزی کریں۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پروفیسر محمد شمیم جیراج پوری کی فعال قیادت میں برابر ترقی کی منزلیں طے کررہی ہے، اب وہ دل فریب قدرتی مناظر سے معمور گچی باؤلی علاقے میں واقع دو سو ایکڑ اراضی پر محیط اپنے کیمپس میں آگئی ہے اور اس میں اس کے کام شروع ہوگئے ہیں اور نئے تعلیمی سال سے کلاس چلنے لگیں گے، پہلے مرحلے میں تعمیر ہونے والی عمارتیں اپنی وسعت، نفاست اور طرز تعمیر کے اعتبار سے منفرد، پرکشش اور جدید سہولتوں سے آراستہ ہیں، پرشکوہ کانفرنس ہال بھی پہلے ہی مرحلے میں تیار ہوگیا ہے، دوسرے مرحلے میں لائبریری، فاصلاتی تعلیم کا مرکز، لکچر ہال، کمپلکس، غیر تدریسی عملہ کے کوارٹرس، کیمپس کے اندر کی سڑکیں اور اوور ہیڈ واٹر ٹینک کی تعمیر کا منصوبہ ہے، یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سمیت ہر سطح پر اردو ہے، اس لئے اس کو اپنی کارکردگی اور مختلف کورسز

کے نصاب تیار کرنے میں بڑی دقتیں پیش آرہی ہیں تاہم دشواریوں کو کام کرنے والوں کا عشق آسان بناتا جارہا ہے اور بہت سارے شعبے اور کورس کھولے جاچکے ہیں اور درجنوں کھولے جانے والے ہیں، اب یونیورسٹی کا پانچواں تعلیمی سال شروع ہونے والا ہے، اس تعلیمی سال میں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت مختلف کورسوں میں داخلے کا اعلان معارف کے اسی شمارے کے ۳۹۶ صفحہ پر ملاحظہ کیجئے، اردو اس ملک کا قیمتی اثاثہ اور سرمایہ ہے، اس کا تحفظ و ترقی ایک وطنی فریضہ ہے، پروفیسر محمد شمیم اس فرض کو جس خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں، اس کے لئے وہ تمام اردو والوں کے شکریے کے اور ان کے رفقا مبارک باد کے مستحق ہیں۔

دارالقلم دمشق عربی کتابوں کی اشاعت کا ایک بڑا مرکز اور مشہور ادارہ ہے، گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں میں جو نابغۂ روزگار اور مشاہیر اربابِ فضل و کمال گذرے ہیں، دارالقلم نے ان کے حالات و کمالات کا مرقع شائع کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے، اب تک ۸۵ نامور اشخاص پر کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں دو ہندستانی نام بھی ہیں اور قارئینِ معارف کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ ان میں سے ایک دارالمصنفین کے بانی علامہ شبلی اور دوسرے ان کے شاگرد رشید اور معمارِ دارالمصنفین مولانا سید سلیمان ندوی ہیں، یہ دونوں کتابیں ایک نوجوان ندوی فاضل ڈاکٹر محمد اکرم کی کدو و کاوش کا نتیجہ ہیں، وہ اس وقت آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامی ریسرچ سینٹر سے وابستہ ہیں، طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ بڑے ہونہار تھے، اور ان کو عربی لکھنے پڑھنے کی مشق تھی، اب ان کی صلاحیتوں سے انشاءاللہ قوم کو فائدہ پہنچے گا، ان دونوں کتابوں کی تصنیف پر ہم انہیں مبارک باد دیتے ہیں، کارکنانِ دارالمصنفین ادارۂ دارالقلم کے بھی ممنون ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ وہ مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی نیز دارالمصنفین کی محققانہ کتابوں کے عربی ترجمے شائع کر کے عالمِ عرب کو ان سے روشناس کرائے گا، دارالقلم نے چودھویں اور پندرھویں صدی کے علماء و مفکرین پر کتابوں کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے، جس کی ابتداء ''ابوالحسن علی الحسنی الندوی'' سے کی ہے، یہ کتاب ڈاکٹر محمد اجتباء ندوی سابق صدر شعبہ عربی الہ آباد یونیورسٹی کی تلاش و محنت کا نتیجہ ہے، جن کو سلیس اور شگفتہ عربی لکھنے پر بڑی قدرت ہے۔

مقالات

قرآنِ عظیم ایک سدابہار معجزہ

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی٭

روئے زمین پر ایسی کوئی کتاب موجود نہیں ہے جو مرورِ ایام کے باعث از کار رفتہ نہ ہوچکی ہو اور اس کے مباحث فرسودہ نہ قرار پاچکے ہوں۔ خاص کر علوم و فنون اور مختلف فلسفوں کی کتابیں آؤٹ آف ڈیٹ ہوتی جارہی ہیں۔ کیونکہ نئے نئے علوم اور نئے نئے اکتشافات کی بدولت قدیم نظریات اور قدیم فلسفے مہمل اور کہنہ سالہ قرار پارہے ہیں، آج ایک نظریہ قائم ہوتا ہے تو کل وہ ٹوٹتا نظر آتا ہے۔ کسی بھی نظریے اور فلسفے کو ثبات و قرار حاصل نہیں ہے۔ لیکن اس باب میں صرف ایک ہی کتاب کا استثنار ہے جو دنیا کے پورے لٹریچر میں اپنی نوعیت کی اولین اور نرالی کتاب ہے اور وہ ہے دین اسلام کا صحیفہ قرآنِ عظیم، جس کی ایک سب سے بڑی اور زبردست خصوصیت یہ ہے کہ نئے نئے علوم اور نئے نئے اکتشافات کے باعث اس کے مضامین و مباحث فرسودہ یا آؤٹ آف ڈیٹ ہونے کے بجائے بالکل تر و تازہ اور اپ ٹو ڈیٹ دکھائی دیتے ہیں اور اس کے معانی و مطالب نکھر نکھر کر سامنے آتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اس کے اسرار و حقائق کے نئے نئے جلووں کا مشاہدہ ہوتا ہے جو نوعِ انسانی کے لئے باعثِ ہدایت ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتاب ہدایت سدابہار اور لازوال ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نرالی خصوصیت کسی انسانی کلام میں نہیں پائی جاتی۔ لہذا ثابت

٭ ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور ۲۹۔

ہوتا ہے کہ قرآنِ عظیم کسی انسانی دماغ کی اختراع نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم میں کائنات اور نظام کائنات کے بارے میں بے شمار حقائق مذکور ہیں جن کی حقیقت سے سابقہ ادوار کے لوگ واقف نہیں تھے لیکن آج علمی ترقی کی بدولت ان کا مفہوم واضح ہوتا جا رہا ہے اور اس کلامِ حکمت کی صداقت و سچائی پر نئی روشنی پڑ رہی ہے اور اس کی حقانیت کے نئے نئے پہلو سامنے آرہے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب حکمت کے نازل کرنے والے نے روزِ اول ہی میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ اس میں دو قسم کی آیات (محکمات و متشابہات) موجود ہیں۔ محکمات سے مراد معنی کے لحاظ سے واضح اور متشابہات سے مراد غیر واضح آیات ہیں، جن کا صحیح مفہوم زیادہ تر مستقبل کے علوم و معارف کی روشنی میں واضح ہونے والا ہو۔ اس سے جہاں ایک طرف ایک ہمہ دان ہستی کا وجود ثابت ہوتا ہے جو علام الغیوب ہے تو دوسری طرف قرآنِ حکیم کی صداقت و سچائی کا ایک نیا روپ سامنے آتا ہے کہ یہ کلام حکمت ایسے غیبی حقائق پر مشتمل ہے جن کا علم سابقہ ادوار کے لوگوں کو نہیں تھا۔ اس لحاظ سے کتاب الٰہی موجودہ دور کے لئے ایک معجزہ ہونے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس بے مثال مظہرِ ربوبیت کی بنا پر آج عصر جدید کے لئے کلامِ الٰہی کی صداقت کا ایک سائنٹفک ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ وہ کسی انسان کا ساختہ پرداختہ نہیں ہو سکتا۔ ورنہ اس میں نئے نئے مسائل کا تذکرہ نہ ملتا اور وہ لازوال سچائیوں سے مملو دکھائی نہ دیتا۔

فطرت و شریعت یا قرآن اور کائنات میں متعدد حیثیتوں سے مشابہت و مطابقت پائی جاتی ہے۔ یہ کائنات چونکہ باری تعالیٰ کی صفتِ تکوین کی مظہر ہے اس لئے اس میں خلاقِ عالم نے اپنے وجود، اپنی یکتائی، اپنی قدرت و خلاقیت اور اپنی ربوبیت و الوہیت کی نشانیاں تمام مظاہرِ فطرت اور ان کے نظاموں میں رکھ چھوڑی ہیں، جو ان کے تحقیقی مطالعے کے

باعث منظر عام پر آتی ہیں۔ مظاہر فطرت کے ان نظاموں کے اصول و ضوابط اور ان کے رموز و اسرار باری تعالیٰ نے اپنی کتاب حکمت میں انتہائی "اختصار" کے ساتھ درج کر دئے ہیں اور یہ رموز و اسرار مظاہر فطرت کی تحقیق و تفتیش کے باعث کھل کر سامنے آتے ہیں اور اس کے اصول و ضوابط کی قدر و قیمت علمی و سائنسی نقطہ نظر سے واضح ہو جاتی ہے، جس کے باعث قرآنِ عظیم ہر دور کے لئے بالکل ترو تازہ اور اپٹوڈیٹ دکھائی دینے لگتا ہے۔

اس اعتبار سے فطرت و شریعت ایک دوسرے کی تفسیر کرتے نظر آتے ہیں۔ یعنی جو کچھ کتاب میں ہے اس کی شرح و تفسیر کائنات میں ہے اور جو کچھ کائنات میں ہے اس کے اصول و ضوابط کتاب اللہ میں مرقوم ہیں اور ان دونوں میں ایک سرِ مو بھی تعارض و تضاد نہیں ہے۔ اس حیرت انگیز مظہر ربوبیت کے ملاحظے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی سرچشمے سے صادر شدہ ہیں۔ یعنی جس ہستی نے اس کائنات کی تخلیق کی ہے اسی نے یہ کلامِ برتر بھی نازل کیا ہے۔ اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ یہ کائنات نہ تو بخت و اتفاق کے تحت یا بغیر کسی خالق کے خود بخود وجود میں آئی ہے اور نہ یہ کلام کسی انسان کا گھڑا ہوا ہے اور اس کا تیسرا نتیجہ یہ کہ اس سے خدائی حکمت و منصوبہ بندی بھی پوری طرح بے نقاب ہو جاتی ہے کہ قرآن اور کائنات کی تطبیق و ہمنوائی سے وہ سارے حقائق اسی طرح ظاہر ہو رہے ہیں جس طرح کہ نقاشِ فطرت نے ان کا منصوبہ بنایا تھا۔

غرض قرآن اور کائنات دونوں اپنی جگہ پر ایک زبردست معجزہ ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک تخلیقی معجزہ ہے تو دوسرا علمی یا کتابی معجزہ۔ اور یہ دونوں متعدد اعتبارات سے ایک دوسرے سے مطابقت و مشابہت رکھنے والے ہیں، جو نوعِ انسانی کو قائل کرانے کے لئے بہت کافی ہیں۔

اس سلسلے میں قرآن عظیم نے دلیل و استدلال کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ حد درجہ انوکھا اور نرالا ہے اور یہ طرز بیان ہر دور کے علوم و معارف کو بنیاد بنا کر کیا گیا ہے، جن کے ملاحظے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقلی یا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تمام ادوار کی مشترکہ ذہنیت اور اس کے بنیادی عناصر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کلام کیا جارہا ہے، جو ہر قسم کے منکرین و معاندین پر صادق آسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے علمی و عقلی دلائل کبھی فرسودہ نہیں ہوسکتے۔ بلکہ ان کی تازگی ہمیشہ برقرار رہتی ہے اور یہ دلائل و براہین جدید سے جدید تر تحقیقات و اکتشافات کے باعث حیرت انگیز طور پر اور زیادہ معنی خیز نظر آتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ عقلی و منطقی اعتبار سے جتنے بھی دلائل ہوسکتے ہیں ان سب کا احاطہ کرلیا گیا ہے اور منکرین حق کے شکوک و شبہات اور ان کے اعتراضات کا معقول و مدلل جواب دیا گیا ہے۔ نیز مختلف علوم و فنون میں موجود نئے نئے دلائل و براہین کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے، جن کی چھان بین سے علمی دلائل کا ایک لامتناہی سلسلہ سامنے آتا ہے۔ اس لحاظ سے قرآن، سائنس اور فلسفے کی کتاب نہ ہونے کے باوجود سائنس اور فلسفے کے مسائل سے بھری ہوئی دکھائی دیتی ہے جو اس کا محیر العقول روپ ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ نئے نئے مسائل کا تذکرہ اور ان پر کلام سائنس اور فلسفے کے مباحث چھیڑے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ کتاب اللہ کی جامعیت و کاملیت کا ایک بے مثال جلوہ ہے، جس کا نظارہ چشم فلک نے اب تک نہیں کیا تھا۔ یہی اس کتاب کا سب سے بڑا معجزہ ہے جو عصر جدید میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس لحاظ سے قرآن عظیم جس طرح شرعی مسائل و مباحث کے لحاظ سے ایک جامع اور کامل صحیفہ ہے، اسی طرح وہ اپنے نوع بنوع دلائل و براہین کے لحاظ سے بھی ایک جامع اور کامل ترین کتاب ہے۔

غرض قرآن عظیم کے دلائل و براہین کی انتہا نہیں ہے جو عالم انسانی کو راہ راست پر

لانے کی غرض سے مذکور ہیں۔ یہی اس صحیفہ ربانی کی اصل ہدایت و رہنمائی ہے جو اس کے بنیادی وصف کے عین مطابق ہے۔ چونکہ خلاق ازل نوع انسانی کی گمراہی کو پسند نہیں کرتا، اس لئے اسے گمراہی کے غار سے باہر نکالنے کی غرض سے اس نے "آیات" اور "بینات" یعنی دلائل ربوبیت کا ایک وسیع نظام قائم کردیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں بے شمار مقامات میں اسلوب بدل بدل کر اور مختلف پیرایے میں نظام فطرت میں موجود ان آیات و بینات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور مختلف طریقوں سے نوع انسانی کو ان کی کھوج لگانے پر ابھارا گیا ہے اور اس سلسلے میں غور و فکر اور تعقل و تفکر پر زور دیا گیا ہے۔ چونکہ عقلی و علمی نقطہ نظر سے اس کائنات میں شرک، مظاہر پرستی اور الحاد و مادیت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اس لئے یہ دلائل و براہین لامحالہ طور پر خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کائنات مادی کا ایک ایک ذرہ، اس کی ڈالی ڈالی اور بوٹا بوٹا خدائے خلاق کی خلاقیت و ربوبیت کا گواہ ہے۔ چنانچہ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے ان مظاہر کے "انوکھے پن" اور ان کے حیران کن نظاموں کی کوئی معقول تشریح و توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ دنیائے سائنس ربوبیت کی اس انوکھی کاریگری اور صناعی کو سمجھنے تک سے قاصر ہے، چاہے اس کا تعلق طبیعیات کی دنیا سے ہو یا عالم حیاتیات سے متعلق۔ حالانکہ اس نے عالم مادیات کے ہفت خواں سر کرلئے ہیں اور چاند ستاروں کی تسخیر تک کرلی ہے۔ چنانچہ آپ اس کائنات کا کونہ کونہ چھان ماریے اور ایک ایک مظہر فطرت کا تفصیلی جائزہ لیجیے، حیوانات و نباتات کا مطالعہ کیجیے یا جمادات و سماوات کا مشاہدہ فرمائیے ہر جگہ آپ کو ربوبیت کی تحیر خیز کاریگری اور بصیرت افروز نظارے ملیں گے اور آپ خدائے خلاق کی گل کاریوں سے عش عش کر اٹھیں گے۔ ہر جگہ حسن کاری، توازن، موزونیت اور رکھ رکھاؤ کا عجیب و غریب نظام دکھائی دے گا اور ان گوناگوں مظاہر اور ان کی رنگارنگیوں کے باوجود

ہر جگہ نظم و ضبط اور تنظیم کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسا منظم اور بے داغ نظام جس میں کہیں بھی رخنہ و شگاف نہ ہو بغیر کسی خالق و ناظم کے وجود میں نہ آسکتا ہے اور نہ برقرار رہ سکتا ہے۔

بہرحال قرآنِ عظیم کے پُرشکوہ اور مضبوط ترین دلائل کی حقیقت و صداقت موجودہ سائنسی تحقیقات و اکتشافات کے دور میں کھل کر سامنے آگئی ہے اور آیاتِ الٰہی اور بینات ربانی کے نئے نئے روپ جلوہ گر ہو کر آنکھوں کو خیرہ کئے جا رہے ہیں، جو مختلف علوم و مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآنی اسرار و عجائب کی انتہا نہیں ہے، جو عالم انسانی کو مبہوت و ششدر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ چونکہ قرآنِ عظیم اپنے معقول اور طاقتور دلائل و براہین کے لحاظ سے ایک معجزہ ہے اس لئے اسے پوری نوعِ انسانی کے لئے "ہدایت نامہ" قرار دیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ	رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن
الْقُرْاٰنُ، هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ	نازل کیا گیا ہے، وہ تمام لوگوں کے لئے
مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ۔	ہدایت ہے، وہ ہدایت کے واضح دلائل
(بقرہ: ۱۸۵)	پر مشتمل اور فرقان (حق و باطل میں فرق
	و امتیاز کرنے والی کسوٹی) بھی ہے۔

اس آیت کریمہ میں صاف صاف طریقے سے بتایا جا رہا ہے کہ ہدایت سے مراد واضح نشانیاں یا دلائلِ ربوبیت ہیں جو ہدایت کا راستہ کھولتے اور دل کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ فرقان بھی ہے یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والی کسوٹی جو کھرے اور کھوٹے افکار و نظریات کو پرکھتی اور انہیں الگ الگ کر دیتی ہے۔ اس لحاظ سے اس کی کسوٹی میں ہر قسم کے

افکار و نظریات کی جانچ پڑتال کی جا سکتی ہے خواہ وہ دورِ قدیم سے متعلق ہوں یا دورِ جدید سے۔ اس لئے وہ سارے جہاں کے لئے ہدایت نامہ ہے اور وہ اپنے دلائل و براہین کی قوت کی بنا پر عالم انسانی کو روشنی کی کرن دکھاتا ہے۔

قرآنِ عظیم کی اصل ہدایت و رہنمائی یہی ہے کہ وہ سارے جہاں کے لئے ہدایت نامہ اور ایک واضح بیان ہے اور اس کی دعوت عام ہے۔ جس کسی کو ہدایت یافتہ بننا ہو وہ اس چشمۂ ہدایت کی طرف آسکتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ	وہی ہے جو اپنے بندے پر کھلے کھلے
اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ	دلائل نازل کر رہا ہے تاکہ وہ تم کو
اِلَى النُّوْرِ، وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ	تاریکیوں سے نکال کر (ہدایت کی)
رَّحِيْمٌ (حدید: ۹)	روشنی کی طرف لے آئے، کیونکہ اللہ
	تم پر بڑا مہربان اور نہایت درجہ
	رحم والا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ، وَاللّٰهُ	یقیناً ہم نے واضح ترین دلائل اتار
يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ	دئے ہیں اور اللہ جس کو چاہتا ہے
(نور: ۴۶)	صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے

یعنی اللہ تعالیٰ اسی کو ہدایت سے سرفراز کرتا ہے جو ہدایت کا طالب ہو۔ چنانچہ وہ کسی کو زبردستی ہدایت نہیں دیتا۔ کیونکہ دلیل و استدلال کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہر شخص دلائل کی قوت کی بنا پر کسی چیز کے حق یا ناحق ہونے کا خود فیصلہ کرے اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر فرمانِ الٰہی ہے:

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ	اور اسی طرح ہم نے اس قرآن کو
وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ۔	کھلے کھلے دلائل سے مزین کرکے اتارا
(حج : ۱۶)	ہے اور اللہ اسی کو ہدایت دیتا ہے
	جو (ہدایت کا) ارادہ کرے [1]

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن عظیم اپنے ان کھلے ہوئے اور واضح دلائل و براہین کی وجہ سے پورے عالم انسانی کے لئے نامہ ہدایت ہے۔ مگر اہل اسلام نے ہدایت کا ایک محدود مفہوم مراد لے کر اس کے اس وسیع مفہوم کو پوری طرح نظر انداز کر دیا ہے، جس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان سے دوچار ہونا پڑا ہے اور اس منفی رویہ کی وجہ سے نوع انسانی کو قرآنی سرچشمہ ہدایت کی طرف لانے کے تمام تقاضے پس پشت چلے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ نوع انسانی کی گمراہیوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

بے شک قرآن مجید اہل ایمان کے لئے بھی از روئے "ھدی للمتقین" ہدایت نامہ ضرور ہے، مگر ہدایت صرف اہل ایمان ہی کے لئے مخصوص ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید پورے عالم انسانی کے لئے عموماً اور اہل اسلام کے لئے خصوصاً ہدایت نامہ ہو سکتا ہے مگر اس کے اہل اسلام کے لئے ہدایت نامہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ محض شرعی مسائل کی تفصیل و تفہیم کے لحاظ سے ہی نامۂ ہدایت ہے، بلکہ اس میں بھی ہدایت کا ایک وسیع تصور مقصود ہے۔ چنانچہ قرآنی نقطہ نظر سے اس کی اصل ہدایت یہ ہے کہ وہ ہر چیز اور ہر نظریہ کے بارے میں صحیح تصور عطا کرتا ہے، چاہے وہ نظام شریعت سے متعلق ہو یا نظام فطرت سے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں متعدد مواقع پر جہاں اہل اسلام کے لئے نامۂ ہدایت ہونے کی بات کہی گئی ہے وہ ایک وسیع پس منظر میں ہے۔ بطور مثال چند آیات ملاحظہ ہوں:

---

[1] معارف: یہ ترجمہ محل نظر ہے، عام مترجمین نے یہ ترجمہ کیا ہے "اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے"۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا	ہم نے آپ پر وہ کتاب نازل کی ہے جو
لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى	ہر چیز کی خوب وضاحت کرتی ہے اور
لِلْمُسْلِمِيْنَ (نحل ۸۹)	(اس بنا پر) وہ اہل اسلام کے لئے
	ہدایت، رحمت اور خوش خبری ہے۔
وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ	یہ کتاب ہم نے آپ کے پاس اس لئے
لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى	بھیجی ہے تاکہ آپ لوگوں کے باہمی اختلافات
وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔	کو کھول کر بیان کر دیں اور (اس بنا پر)
(نحل : ۶۴)	وہ ایمان رکھنے والوں کیلئے ہدایت و
	رحمت ہے۔
يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ	اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ	کی جانب سے موعظت اور دلوں کے
وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔	روگ کا (سامان) شفا آچکا ہے اور
(یونس : ۵۷)	(اس بنا پر) وہ اہل ایمان کے لئے
	ہدایت و رحمت ہے۔

یا اور اس قسم کی دیگر آیات کے ذریعہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ قرآن حکیم کا اہل ایمان کے لئے ہدایت نامہ ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ چیز یا فطرت و شریعت کے ہر مسئلے کی وضاحت کرنے والا لوگوں کے باہمی فکری و نظریاتی اختلافات کو دور کرنے والا اور نوع انسانی کے دلی امراض کے لئے دوائے شافی عطا کرنے والا ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس لحاظ سے چونکہ یہ صحیفۂ حکمت نئے نئے مسائل میں صحیح رہنمائی کرنے والا اور ہر

چیز کی وضاحت بخوبی کرنے والا ہے اس لئے وہ اہل اسلام کے لئے رحمت و بشارت کا باعث ہے۔ یعنی نئے نئے علوم و معارف کے ظہور کے بعد جب فکری دنیا میں انتشار برپا ہو جائے۔ جس طرح کہ ۱۹۶۹ء میں چاند کی فتح کے بعد علمی دنیا میں عجیب طرح کی بدحواسی طاری ہو گئی تھی تو ایسے مواقع پر کتاب الٰہی اہل اسلام کی صحیح رہنمائی کرے، تاکہ ان کے ایمان میں کسی طرح کی لغزش پیدا نہ ہو جائے بلکہ ان کے پائے ثبات دین الٰہی پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں۔ اسی وجہ سے نئے نئے مسائل میں اہل ایمان کی ہدایت ضروری ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ارشادِ باری ہے:

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ	کہہ دو کہ اس کتاب کو روح القدس نے
رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا	تمہارے رب کی جانب سے حقانیت
وَهُدًى وَّبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ۔	کے ساتھ اتارا ہے تاکہ وہ اہل ایمان
(نحل: ۱۰۲)	کے قدم جمائے رکھے اور (اس لحاظ سے)
	وہ اہل اسلام کے لئے ہدایت و بشارت ہے

ظاہر ہے کہ اس قسم کے احکام و مسائل میں صحیح رہنمائی کرنا دین ابدی اور کتاب ابدی کی ہی خصوصیت ہو سکتی ہے جو مستقبل میں پیش آنے والے حالات و واقعات میں ہدایت و رہنمائی کا مکمل سامان اپنے اوراق کے اندر رکھتی ہو، تاکہ اہل اسلام کبھی گمراہ نہ ہونے پائیں۔ اس بحث سے بخوبی واضح ہو گیا کہ ہدایت کا وہ محدود مفہوم ہرگز مراد نہیں ہے جو آج کل مسلمانوں کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے، جب کبھی کوئی نئی بحث چھڑتی ہے تو وہ فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ قرآن مجید علوم و مسائل کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کا موضوع ہدایت ہے اور ہدایت سے مراد ان کے نزدیک محض چند شرعی مسائل ہیں اور بس۔ ذٰلک مبلغھم من العلم۔

حاصل کلام یہ کہ قرآن عظیم سارے عالم انسانی کے لئے عموماً اور اہل اسلام کے لئے خصوصاً ہدایت نامہ ہے۔ مگر اس کے ہادی و رہنما ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ محض چند شرعی و اخلاقی مسائل میں رہنمائی کرتا ہے، بلکہ اس کی اصل رہنمائی اس کے وہ علمی و عقلی دلائل و براہین ہیں جو سارے جہاں کے لئے باعث ہدایت ہیں اور وہ اپنی حجیت کے لحاظ سے دلیل و استدلال کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ چنانچہ نئے نئے علوم و معارف کے ظہور کے بعد اس کے یہ دلائل اور زیادہ توانا اور موثر طور پر عالم انسانی کو جھنجھوڑنے اور ان کے اذہان کو صیقل کرنے والے ہوتے ہیں جو نئی نئی سمتوں میں پیش قدمی کرتے ہوئے ہر علم و فن کے اندر پوشیدہ "خدائی حجت" کو ڈھونڈ نکالنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس لئے علوم و معارف کے سمندروں کو چھاننا ضروری ہے، جس کے بغیر گوہر مراد حاصل نہیں ہو سکتا۔ آج علوم و فنون کی یہ کھیتی پک کر تیار ہو گئی ہے اور اب فصل کاٹنے کا وقت آ گیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اہل اسلام ایک محدود تصور لئے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ باندھے بیٹھے ہیں تو اس میں قصور کس کا ہے؟ باری تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ یہ کتاب عظیم سارے جہاں کو ڈرانے اور اسے متنبہ کرنے کی غرض سے نازل کی گئی ہے:

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ	بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے اپنے
عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ	بندے پر فرقان (حق و باطل میں تمیز
نَذِيرًا (فرقان: ۱)	کرنے والی کسوٹی) نازل کی تاکہ وہ
	سارے جہاں کو متنبہ کر سکے۔

یہ قرآن عظیم کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ وہ ہر دور میں سارے جہاں کے لئے "فرقان" ہے۔ اسی عظیم صفت کی بنا پر اس کا دوسرا نام ہی فرقان قرار پا چکا ہے اور اسی

زبردست وصف کی بنا پر وہ تا قیامت ہر دور کے لئے ایک معجزہ رہے گا۔ یعنی دلیل واستدلال کے میدان میں وہ باطل نظریات اور باطل فلسفوں کو پچھاڑتا رہے گا تاکہ خداوند قدوس کی دلیل ہمیشہ غالب رہے۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے:

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل: ۸۱)

کہہ دو کہ (دین) حق آگیا اور باطل مٹ گیا، باطل کو تو لامحالہ مٹنا ہی ہے

لہٰذا آج دنیا کے ہر علم و فن میں گھس کر باطل افکار و نظریات اور باطل فلسفوں کو علمی و عقلی میدان میں شکست دینا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے تاکہ اس کے نتیجے میں کلمۂ الٰہی کا بول بالا ہو اور جب تک یہ عمل پورا نہ ہو اسلام کی نشاۃ ثانیہ عمل میں نہیں آسکتی۔ موجودہ علوم و فنون کی ترقی کے باعث اس علمی معرکے کے لئے میدان ہموار ہوگیا ہے اس لئے آج مسلمانوں کو حق و باطل کی اس لڑائی کے لئے پوری طرح کمربستہ ہوجانا چاہئے۔ خاموشی ان کے لئے شرعاً حرام ہے۔ کیونکہ آج مسلمانوں کے لئے زندگی اور موت کا سوال پیدا ہوگیا ہے۔ اگر وہ جسمانی جہاد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو علمی جہاد تو کرسکتے ہیں لیکن ان دونوں قسم کے جہاد سے منہ موڑنے کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ حیرت ہے کہ مسلمان ایسی زبردست خصوصیت والی کتاب کے حامل ہونے کے باوجود جو علمی اعتبار سے دنیا کو اٹھا اور بٹھا سکتی ہے۔ آخر کیسے اور کس بنا پر غافل اور لاپرواہ ہیں؟ کیا ان کے لئے اس کتاب عظیم کی صحیح عظمت سے واقف ہونے اور اس پر عمل کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا؟

واقعہ یہ ہے کہ آج قرآن عظیم کے علمی و عقلی دلائل پوری نوع انسانی کو چیلنج کررہے ہیں اور دلیل و استدلال کے میدان میں اسے للکار رہے ہیں۔ اگر اہل اسلام قرآن حکیم کی رہنمائی میں اس کے ان دلائل کو مختلف علوم و فنون اور خاص کر جدید تحقیقات و اکتشافات کی روشنی میں مدون

کرکے انہیں دعوتی انداز میں نوع انسانی کے سامنے پیش کریں تو اس سے اچھے نتائج نکلنے کی امید ہے۔ تاکہ وہ قرآنی ہدایت سے راہ یاب ہوسکے۔ یہ دلائل چونکہ خود مادہ پرستوں کی تحقیقات واکتشافات پر مبنی ہونے کی وجہ سے ان پر زیادہ بہتر طور پر اثر انداز ہوسکتے ہیں اور انہیں نظر انداز کرنا کسی کے لئے بھی آسان نہ ہوگا۔ ان دلائل کے سامنے آجانے کے بعد جس کو مرنا ہو وہ دلیل دیکھ کر مرجائے اور جسے زندہ رہنا ہو وہ دلیل دیکھ کر زندہ رہے گویا کہ خدا کی حجت پوری ہوچکی ہے:

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۔ (انفال: ۴۲)

تاکہ جس کو مرنا ہو وہ اتمام حجت کے بعد مرے اور جو زندہ رہے وہ اتمام حجت کے بعد زندہ رہے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُبِينٌ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ ۔ (یٰس: ۶۹-۷۰)

یہ تو ایک تذکرہ اور واضح قرآن ہے تاکہ وہ ڈرائے اس کو جو (ذہنی اعتبار سے) زندہ ہے اور منکرین پر بات (حجت) پوری ہوجائے۔

لہٰذا اسلام کے علم برداروں پر یہ شرعی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ قرآن عظیم کے ان علمی و عقلی دلائل و براہین کو جدید علوم کی روشنی میں مرتب و مدون کرکے نوع انسانی کے لئے ہدایت و رہنمائی کا سامان مہیا کریں تاکہ وہ یا تو راہ راست پر آجائے یا اس پر خدا کی حجت پوری ہوجائے۔ مگر یہ کام کسی ایک یا دو افراد کے کرنے کا نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی اکا دکا شخص تمام علوم و فنون اور تمام مسائل و مباحث پر حاوی نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس عظیم کام کے لئے ایک ٹیم ورک ضروری ہے۔ یعنی ایک ایسی جماعت کی تشکیل جو مختلف علوم و فنون

پر عبور رکھنے والی ہو۔ ورنہ یہ کام موثر طور پر انجام نہیں پاسکتا اور کتاب اللہ کی حجت پوری
نہیں ہوسکتی۔ یہ کام امت مسلمہ کے ذمہ ایک قرض ہے اور جب تک وہ اس قرض کو ادا نہیں
کرتی موجودہ گمراہیوں کا استیصال نہیں ہوسکتا اور مسلمان جب تک اپنا یہ شرعی فریضہ
ادا نہیں کرتے، عالم انسانی کی گمراہی کے بھی وہی ذمہ دار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے کام بتا
دیا اور کام کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا لہذا اب انہیں مزید کس چیز کا انتظار ہے؟ یہ ایسا کام
ہے جس میں نہ صرف اہل اسلام کی نجات ہے بلکہ خود پورے عالم بشری کے لئے بھی سامانِ
نجات ہے۔ یہ پوری امت مسلمہ کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

نوٹ: یہ مضمون راقم کی نئی کتاب "فطرت و شریعت میں مشابہت: اور قرآنی اسرار
وحقائق پر ایک نظر" کا مقدمہ ہے، جو زیر طبع ہے۔

علمائے اسلام کے نام ایک کھلا خط[1] نئی صدی کے آغاز ہی میں اسلام اور مسلمانوں
کی بقا کے لئے عجیب نئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ آج اہل قبلہ کی زندگی اور موت کا سوال
پیدا ہوگیا ہے۔ آنے والے واقعات اور بھی زیادہ سنگین ہوسکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ بھیانک
صورت حال کیوں اور کیسے پیدا ہوئی؟ کیا اسلام ایک سچا اور برحق دین اور قرآن مجید کلام
الٰہی نہیں ہے؟ تو پھر اہل اسلام پر مار پر مار کیوں پڑ رہی ہے اور وہ بے وقعت، ذلیل و رسوا
کیوں کئے جارہے ہیں؟ اگر ہم زوال ملت کے اسباب وعوامل کا جائزہ لیں تو ہمیں صاف نظر
آئے گا کہ اس کا اصلی اور بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے دین الٰہی کے تقاضوں پر عمل کرنا اور

[1] مولانا کا مضمون کتابت کے لئے دیا جاچکا تھا کہ ان کی وفات کی خبر ملی، ان کا یہ دردمندانہ مکتوب
مارچ کا معارف شائع ہونے کے بعد ملا، عدم گنجائش کی وجہ سے یہ اپریل میں شامل نہیں کیا جاسکا۔
اسے "معارف کی ڈاک" کے بجائے ان کے مضمون کے ضمیمہ کے طور پر شائع کیا جاتا ہے۔ "ض"

کتاب الٰہی کے پیغام کو اقوام عالم تک پہنچانے کا کام پوری طرح ترک کر دیا ہے، جس کی سزا
آج ہم بھگت رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج کل کے مسلمان عالم انسانی کو قرآن حکیم کی
دعوت دینا اور اس کے حقائق ومعارف سے لوگوں کو واقف کرانا تو درکنار خود ہی نہیں جانتے
کہ قرآن میں ہے کیا؟ عوام تو عوام خود بعض علماء کا بھی یہی حال ہے، جو اپنے سطحی علم کی بنا پر
اسے قصے کہانیوں یا زیادہ سے زیادہ شرعی احکام ومسائل کی کتاب سمجھتے ہوئے اس کے
ان مسائل ومباحث سے بے تعلق نظر آرہے ہیں جو عالم انسانی کی ہدایت کا سامان ہیں۔
حالانکہ کتاب الٰہی پوری نوع انسانی کی ہدایت کے لئے نازل کی گئی ہے اور اس مقصد کے
لئے اس میں خالص علمی دلائل بھی کھلے انداز میں موجود ہیں (دیکھئے بقرہ: ۱۸۵، نیز ۱۶۴،
آل عمران: ۱۹۰-۱۹۱، ذاریات: ۱۰-۱۱ اور حٰم سجدہ: ۵۳ وغیرہ) چنانچہ کلام الٰہی میں جگہ
جگہ ان دلائل وبراہین (قرآن کی زبان میں آیات بینات) کا تذکرہ اسلوب بدل بدل کر کیا گیا ہے۔
یہ ایک مستقل علم ہے، جسے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن کے پانچ بنیادی علوم
میں سے ایک قرار دیتے ہوئے "اللہ کی نعمتوں کے ذریعہ تذکیر" کے نام موسوم کیا ہے (دیکھئے
الفوز الکبیر) جب کہ امام غزالیؒ نے اسے "علم مباحث" کا نام دیا ہے (دیکھئے جواہر القرآن)
اور اسے ہم موجودہ زبان میں "قدرت کی نشانیوں" یا "دلائل ربوبیت" کا علم کہہ سکتے ہیں، جو نظام
کائنات کے حقائق سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ آج جدید سائنسی تحقیقات واکتشافات کی روشنی
میں یہ دلائل ربوبیت کھل کر سامنے آگئے ہیں جو کفر وشرک اور الحاد و مادیت کا رد وابطال
کرنے اور باری تعالیٰ کا وجود اور اس کی توحید وربوبیت کو ثابت کرنے والے ہیں۔ نیز یہ
دلائل آج ہمارے اور منکرین خدا کے درمیان بحث ومباحثے کے لئے "موضوع بحث"
بن سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے آج قرآن حکیم کا یہ نیا روپ اس کے نئے معجزے کی حیثیت

رکھتا ہے جو اقوام عالم کی آنکھیں کھولنے اور ان کو راہ ہدایت سے سرفراز کرنے میں نہایت درجہ اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ مگر آج کتنے علماء ایسے ہیں جو ان دلائل و براہین کی نوعیت واہمیت کو سمجھتے ہیں اور قرآن کے اس تقاضے کے مطابق نوع انسانی کو راہ ہدایت سے روشناس کرا سکتے ہیں؟ اگر ہم قرآنی تقاضوں کے مطابق اجتماعی طور پر کام کرتے اور اللہ کا پیغام تمام اقوام عالم تک پہنچانے کی خدمت انجام دیتے تو اسلام اور مسلمانوں کی وہ رسوائی ہرگز نہ ہوتی جو آج ہو رہی ہے کہ مسلمان ہر جگہ گاجر مولی کی طرح کاٹے جا رہے ہیں اور دین اسلام کو ایک دہشت گردانہ مذہب قرار دیا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ بات واقعاتی طور پر غلط اور گمراہ کن ہے لیکن زبانی جمع خرچ سے ذہنی وفکری دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ لہٰذا اب ہمیں ملت کی تعمیر نو اور بنی آدم کی اصلاح و رہنمائی کے لئے نئے سرے سے جائزہ لے کر اپنی صفوں کو درست کرنا ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ آج ہمارے پاس قرآن حکیم جیسی ابدی و سرمدی کتاب موجود ہے جو علمی حقائق و معارف سے لبریز ہر دور کے علوم و مسائل میں عالم انسانی کی عموماً اور اہل اسلام کی خصوصاً مکمل رہنمائی کرنے کی استطاعت رکھتی ہے لیکن جب ہم نے مسائل حیات کا جائزہ اس کتاب ابدی کی روشنی میں لینا اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنا چھوڑ دیا تو ہم پر ذلت و مسکنت طاری کر دی گئی، جس طرح پچھلے ادوار میں یہود و نصاریٰ کا حال ہوا تھا۔ لہٰذا اب نئی صدی کے چیلنجوں کا مقابلہ کتاب الٰہی کے ابدی حقائق اور سائنٹفک دلائل کے ذریعہ ہونا چاہئے، تاکہ عصر جدید پر اللہ کی حجت پوری ہو جائے۔ واضح رہے ہر دور میں نئے نئے علوم کی ترویج و اشاعت کے باعث نئے نئے فکری و نظریاتی مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن میں عالم انسانی کی رہنمائی ضروری ہوتی ہے۔ آج سائنسی علوم کا ڈنکا بج

رہا ہے جو عالم انسانی کے اذہان پر چھائے ہوئے ہیں اور ان علوم نے آج بہت سے نئے فکری مسائل پیدا کر دئے ہیں جن میں [illegible] کی تشفی بخش رہنمائی نہ ہونے کے باعث وہ گمراہی کے راستے پر چل پڑا ہے۔ حالانکہ قرآن حکیم میں اس صورت حال سے نپٹنے کا پورا پورا سامان موجود ہے، مگر علمائے کرام اس میدان میں بہت پیچھے ہو گئے ہیں۔ کیونکہ وہ سائنسی علوم و مسائل سے ناواقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان داعی بننے کے بجائے مدعو بنتے دکھائی دے رہے ہیں اور یہ اندوہ ناک صورت حال اس وقت باقی رہے گی جب تک کہ ہم سائنسی علوم سے آگاہ ہو کر قرآنِ حکیم کی روشنی میں عصری چیلنجوں کا مقابلہ نہیں کرتے۔ اسی پر کار خلافت اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا دار و مدار ہے۔ لہٰذا اب اس میدان کو سر کرنے کے لئے بلا تاخیر چند اقدامات کرنے ہیں (۱) عوام کو قرآن کی اصل تعلیمات اور اس کے مقاصد سے آگاہ کرایا جائے (۲) اور اس مقصد کے لئے جمعہ کے خطبات کا موضوع بدلا جائے (۳) عربی مدارس میں سائنسی علوم کی تعلیم لازمی کر دی جائے تاکہ ہمارے علماء کی نئی کھیپ دینی علوم کے ساتھ سائنسی علوم سے بھی آراستہ ہو کر قرآن عظیم کے نئے معجزے کو سمجھنے اور اس کے تقاضوں کے مطابق عالم انسانی کو قرآنی ہدایت سے صحیح طور پر واقف کرانے کے قابل بن سکے (۴) اور سب سے بڑھ کر اب ہم کو یہ کرنا ہے کہ قرآن عظیم کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کا مرکز و محور بنا کر اسے عصر جدید کا سب سے بڑا ایجنڈا قرار دینا اور اس کی روشنی میں عصری علوم و مسائل کا جائزہ لے کر بنی آدم کی صحیح رہنمائی کرنا ہوگا۔ تب جا کر ہم بارگاہِ الٰہی میں سرخرو ہو سکتے ہیں [illegible] دنیا والوں کی نظر میں بھی ہمارا اعتبار قائم ہو سکتا ہے۔ یاد رکھئے کہ اللہ کی ہدایت اور اس کے دلائل و براہین کو نوع انسانی سے چھپانا ایک بہت بڑا شرعی جرم ہے، جو ہمارے لئے لعنت کا

باعث ہے (دیکھئے سورہ بقرہ آیات ۱۵۹-۱۶۰ نیز ۱۷۴-۱۷۵) کیونکہ عالم انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے ذمہ دار مسلمان ہی ہیں جنھوں نے آج اپنا یہ شرعی فریضہ ترک کرکے آپس ہی میں جھگڑنا شروع کردیا ہے اور ایک دوسرے پر کفر اور گمراہی کے "فتوے" صادر کر رہے ہیں۔ یہ صورت حال بڑی ہی دردناک اور عبرت ناک ہے۔

اس موقع پر یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعوت دین کے تین طریقے بتائے ہیں جو یہ ہیں (۱) حکمت کے ذریعہ (۲) اچھی نصیحت کے ذریعہ (۳) اور مباحثہ کے ذریعہ (نحل: ۱۲۵) چنانچہ مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ پہلا طریقہ اہل علم کے لئے ہے کہ ان سے دلائل کی روشنی میں گفتگو کی جائے (۲) عوام کو سیدھے سادے انداز میں سمجھایا جائے (۳) اور منکرین سے علمی مباحثہ کیا جائے۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم کے علمی دلائل و براہین پہلے اور تیسرے طبقے کے لئے بے حد مفید ہیں، جو آج سائنسی علوم کی روشنی میں کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ لہٰذا اب علما کا فرض ہے کہ وہ ان علمی و عقلی دلائل سے آگاہ ہو کر گمراہ انسانوں کی صحیح رہنمائی کریں، یہی موجودہ دور کا سب سے بڑا اجہاد ہے، جسے خود باری تعالیٰ نے "بڑا جہاد" قرار دیا ہے۔ (فرقان: ۵۲)

اس لحاظ سے یہ اکیسویں صدی کا جہاد ہے جو ایک خالص "علمی جنگ" ہے اور وہ عالم انسانی کے اذہان کو بدلنے کی راہ میں بے حد مفید اور انشاء اللہ فیصلہ کن ہو سکتی ہے اور یہ تیر اور تلوار سے زیادہ کارگر ہو سکتی ہے۔ اس راہ میں راقم نے اپنی پوری زندگی وقف کرکے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں جو اس راہ میں کام کرنے والوں کی رہنمائی کر سکتی ہیں اور اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کام سے رغبت رکھنے والے علما کو بعض کتابیں مفت دے دی جائیں تاکہ اس تحریک کو آگے بڑھایا جائے لہٰذا علما حضرات اپنا پتہ تحریر کرکے چند کتابیں حاصل کر سکتے ہیں۔

علمائے ہند کی چند قلمی عربی تصنیفات

از
ڈاکٹر محمد عتیق الرحمان ٭

(یہ مقالہ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دو روزہ نیشنل سیمینار منعقدہ ۱۸-۱۹ فروری ۹۹ء میں پڑھا گیا تھا۔) عتیق

عربی زبان اپنے اسلوب بیان کی دل کشی و رعنائی، الفاظ و معانی کی وسعت، امثال و حکم کی خوبی و خوب صورتی اور فصاحت و بلاغت کی شگفتگی و شائستگی کی بنا پر دنیا کی تمام زبانوں میں ممتاز و منفرد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بے شمار اہل علم و لغت نے اس کی جانب توجہ و اعتنا کی ہے اور اس کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا ہے اور اس زبان کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، اسی بنا پر تاریخ کے ہر دور میں اس زبان کی ترقی اور اس کی شہرت و مقبولیت میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہا۔

ہندوستان کی سرزمین میں بھی ہر دور میں علما و محققین کی ایک جماعت اس زبان کی خدمت اور نشر و اشاعت میں حصہ لیتی رہی ہے، بلکہ بعض علما نے عربی زبان میں اسلامی علوم و فنون کی بہت نمایاں خدمات انجام دی ہیں، اس سلسلے میں شیخ حسن صغانی لاہوری (م ۶۵۰ھ/

٭ خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ

۱۲۵۲ء) قاضی شہاب الدین دولت آبادی (۸۴۹ھ/۱۴۴۵ء) شیخ علی متقی برہانپوری (م ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء) ابو الفیض فیضی (م ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء) شیخ احمد بن محمد الیمنی (اوائل ۱۳ویں صدی ہجری) مولانا عبد العلی بحر العلوم (م ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۱۹ء) اور مولانا عبد الحئی فرنگی محلی (م ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء) کے نام قابل ذکر ہیں، جن کی علمی و دینی حیثیت پوری علمی دنیا میں مسلم ہے اور جن کی علمی و ادبی خدمات سے عربی زبان و ادب مالا مال ہے۔ ان علماء کے علاوہ مشرقی کتاب خانوں کو کھنگھالنے سے ہمیں مزید ایسے علماء و فضلاء کے نام ملتے ہیں جن کی علمی و ادبی خدمات نہایت شاندار ہیں اور جنھوں نے اعلیٰ تحقیقات کے نمونے یادگار چھوڑے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کی تصنیفات و تالیفات تک اب تک ہماری رسائی نہیں ہوسکی اس لیے وہ گوشۂ گم نامی میں پڑی ہوئی ہیں اور ہم ان کی قدر و قیمت تو در کنار ان کے نام سے بھی واقف نہیں۔ حالانکہ علم و فن کی ترقی کے اس دور میں اہم اور بلند پایہ علمی، ادبی اور تحقیقی تصنیفات کی تلاش و جستجو اور تحقیق و تدوین اور تحشیہ کے بعد ان کی اشاعت نہایت ضروری ہے تاکہ علمی دنیا ان سے اور ان کی علمی و ادبی قدر و قیمت سے بہ خوبی واقف ہوسکے۔

اسی ضرورت کو محسوس کرکے آج کے سیمینار کے موضوع "عربی زبان و ادب میں علمائے ہند کے مخطوطات" کو غنیمت جان کر میں نے خدا بخش لائبریری پٹنہ کے عربی مخطوطات کا جائزہ لینا شروع کیا اور اس ضمن میں کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد، بوہار لائبریری کلکتہ، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ اور دیگر کتب خانوں کی فہرستوں پر بھی نظر ڈالی تو مجھے ان تمام کتب خانوں میں سب سے زیادہ عربی زبان و ادب کا ذخیرہ خدا بخش

لائبریری پٹنہ میں ملا، علمائے ہند کی تصنیفات کے تقریباً ساٹھ مخطوطے ہیں جن میں اکثر اہم اور نادر ہیں۔ یہ مخطوطات صرف و نحو، فصاحت و بلاغت، شاعری، انشا پردازی اور ان کے شرح و حواشی سے متعلق ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے کتب خانوں کی فہرستوں میں عربی مخطوطات کی تعداد بہت کم نظر آئی۔ کتب خانہ آصفیہ کی فہرست میں تیرہ[۱۳] کا اندراج ملتا ہے۔ ایشاٹک سوسائٹی کلکتہ میں پانچ[۵] اور بوہار لائبریری کی فہرست میں صرف چار[۴] مخطوطات پائے جاتے ہیں۔ اس سے آپ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ عربی زبان و ادب پر ہندوستانی علماء کی تصنیفات و تالیفات کا کتنا شاندار ذخیرہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ اس مختصر مضمون میں خدا بخش لائبریری کے تمام ادبی ذخیروں کا تعارف پیش کرنا تو ممکن نہیں، اس لئے صرف چند علمائے ہند کی علمی و ادبی خدمات کے تعارف پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کے علاوہ جن علماء کے حالات تذکروں میں مل سکے ہیں ان کے حالات بھی تحریر کر دئے گئے ہیں۔

۱۔ محمد فرید بن محمد شریف احمد آبادی (گیارہویں صدی ہجری): محمد فرید بن محمد شریف احمد آبادی ۱۱ویں صدی ہجری کے عالم ہیں جو احمد آباد کے باشندے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اس لئے اپنے نام کے ساتھ صدیقی لکھتے تھے ان کی زندگی کے حالات و واقعات ہمیں عام تذکروں میں نہیں ملتے، تاہم ان کی ایک تصنیف الحاشیۃ علی حاشیۃ المطول کے نام سے خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ جس میں سالِ تصنیف ۱۰۶۰ھ درج ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ محمد فرید ۱۰۶۰ھ میں زندہ تھے۔ مصنف نے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ جس زمانے میں وہ حاشیہ مطول (للخطائی) اپنے والد بزرگوار سے پڑھ رہے تھے اسی زمانے میں انھوں نے اپنے دوستوں کے استفادہ

کے لئے یہ کتاب تصنیف کی تھی۔ خدا بخش لائبریری کا نسخہ اپنی قدامت وصحت کے لحاظ سے نہایت اہم ہے، کیوں کہ اس کے آخر میں ایک ترقیمہ ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کاتب محمد عبد العظیم ہیں جو شیخ محمد فرید بن محمد شریف احمد آبادی کے پوتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ نسخہ ۱۱۴۲ھ میں مصنف کے اصل نسخے سے نقل کیا گیا ہے جس سے اس کی مزید اہمیت بڑھ جاتی ہے، ترقیمہ ملاحظہ ہو:

"تمت کتابۃ تحشیۃ مولانا وجدنا محمد فرید بن شیخ محمد شریف بن شیخ فرید الصدیقی علی حاشیۃ الفاضل الکامل العلامہ الفہامہ مولانا عبد الحئی الخطائی الشہیر بمولازادہ علی المطول بید اصغر الخلیقۃ بل لاشئی فی الحقیقۃ اضعف عباد اللہ الکریم محمد عبد العظیم بن محمد عبد الرحیم عرف عبد الملک کان اللہ لہم نقلت ہذہ الحاشیۃ تمامہا من اصلہ یعنی من خط مصنفہ ومولفہ قدس اللہ سرہ العظیم۔ ۱۱۴۲ھ۔"

کتاب کے شروع صفحہ پر لسان السلطان محمود الدولہ منشی محمد صفدر علی خاں بہادر کے نام کی ایک مہر ملتی ہے۔ جس پر مہر کا سال ۱۲۷۷ھ درج ہے۔ یہ قلمی نسخہ ۲۴۰ اوراق پر مشتمل ہے اور واضح خطِ نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔

اس تصنیف کی زبان صاف ستھری، عام فہم اور واضح ہے، اسے ہر طالب علم بہ آسانی پڑھ کر سمجھ سکتا ہے۔ ہندوستان میں مطول کے حواشی اور پھر ان کے حواشی بہت سارے لکھے گئے ہیں، لیکن زبان کی سادگی اور الفاظ کی خوبصورت تشریح وتوضیح کے لحاظ سے یہ تصنیف ہندوستان کے اہم حواشی میں شمار ہونے کے لایق ہے۔

۲۔ ابوبکر بن محسن علوی (۱۲ویں صدی ہجری): سید ابوبکر بن محسن علوی ۱۲ویں صدی ہجری کے عالم ہیں جو عربی ادب وانشا پردازی میں بلند پایہ رکھتے ہیں۔ یہ اصل میں

عرب تھے لیکن کافی عرصہ تک ہندوستان میں مقیم رہے۔ ان کے حالاتِ زندگی تذکرہ کی کتابوں میں نہیں ملتے تاہم ان کی ایک تصنیف المقامات الہندیہ کے نام سے ملتی ہے جس میں سال تصنیف سنہ ۱۱۲۸ھ درج ہے۔ اس سے ہمیں ان کے عہد کا علم ہوتا ہے اور ان کی علمی وادبی لیاقت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ المقامات الہندیہ کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے[1]۔ جس میں ۱۱۵ اوراق ہیں۔ معمولی خطِ نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ جس کی کتابت خط شکستہ سے قریب معلوم ہوتی ہے اور جو مشکل سے پڑھنے میں آتی ہے۔ اس کے آخر میں ترقیمہ ملتا ہے جس میں سال کتابت سنہ ۱۲۷۴ھ درج ہے، اس کے کاتب محمد ولی اللہ بن عبد العزیز جعفری ہیں جو مچھلی شہر کے باشندہ تھے۔ ترقیمہ ملاحظہ ہو:

"قد تمت کتابۃ الکتاب المستطاب بعون الملک الوہاب فی سبعۃ عشر من شہر شعبان سنہ ۱۲۷۴ الف ومأتین واربع وسبعین من ھجرۃ خیر الانام وافضل البشر علیہ الصلوۃ والتحیات بید الفقیر محمد ولی اللہ بن جناب العالم الاکبر مولانا الحافظ محمد عبد العزیز الھاشمی الجعفری القرشی الاحمدی الحنفی در قصبہ لطافت بجس عن مچھلی شہر۔"

مقامات ہندیہ کی وجہ تصنیف مقدمہ میں یہ بتائی گئی ہے کہ مقامات حریری چونکہ مشکل، عسیر الفہم اور دقت طلب کتاب ہے۔ اس لئے مقامات ہندیہ لکھی گئی اور اس کے لئے آسان زبان اور عام فہم اسلوب اختیار کیا گیا تاکہ ہر شخص اس کا معنی ومفہوم سمجھ سکے اس سلسلے میں مصنف نے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک روز نماز عصر کے بعد اپنے

---

[1] مزید قلمی نسخوں کے لئے دیکھئے عربی ادبیات میں پاکستان وہند کا حصہ ص ۲۱۱۔

چند احباب کے ساتھ تفریح میں نکلے ہوئے تھے۔ اسی اثنا میں مقامات حریری پر گفتگو ہونے لگی تو انہوں نے احباب سے اس کے بعض الفاظ کے معنی ومفہوم دریافت کئے لیکن وہ لوگ ایک لفظ کا معنی بھی نہیں بتا سکے۔ مصنف کو اس سے بڑا صدمہ اور سخت حیرت ہوئی۔ احباب کو بھی ندامت وشرمندگی محسوس ہوئی اس لئے انہوں نے ان کی درخواست پر مقامات حریری کے طرز پر یہ کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا، جو آسان، سہل اور عام فہم ہے۔ اس واقعہ کو وہ خود بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خرجت ذات یوم بعد صلوٰۃ العصر... مع بعض ادباء العصر واستجبت معنی المقامات الحریریہ والنوابغ والمقامات الزینیہ وکان معنا جماعۃ لیس لھم تعلق بعلوم العربیۃ ولا علی النکت الادبیۃ فنفرت طباعھم حتی صار الواحد منھم لا یجیب من ناداہ۔ ولا شک ان من جھل شیأ عاداہ فعند ذالک اشار علی بعض من حضر کانشاء مقامات یتھما القاصی والدانی غیر محتاجۃ الفاظھا الی التفتیش فی کتب اللغۃ والمعانی فانشأت ھذہ المقامات حسب الاشارۃ وتجنب الوحشی والغریب فی العبارۃ۔

میں ایک روز بعد نماز عصر اپنے چند احباب کے ساتھ تفریح کے لئے نکلا، دوران تفریح میں نے ان سے مقامات حریری سے چند سوالات کئے اور معنی دریافت کئے۔ میرے ساتھ جو لوگ تھے وہ عربی علوم اور اس کے ادبی نکات سے نابلد تھے اس لئے میرے سوال کے جواب نہیں دے سکے، بلاشبہ جو آدمی کسی چیز سے ناواقف ہوتا ہے تو وہ اس پر ناراضگی ظاہر کرتا ہے۔ ان احباب نے اس وقت مجھ سے درخواست کی کہ میں ایسے مقامات لکھوں کہ ہر خاص وعام انہیں سمجھ سکیں اور اس کے الفاظ ایسے عام فہم ہوں کہ ان کے لئے انہیں لغت ومعانی کی کتاب دیکھنے کی ضرورت نہ پڑے، چنانچہ ان کے کہنے پر میں نے یہ مقامات لکھے جن میں غریب اور نامانوس عبارت سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب میں مقامات حریری کے طرز پر دو کرداروں کی زبانی حالات وواقعات بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ دونوں کردار ہندوستانی ہیں۔ ایک کا نام ناصر بن فتاح ہے اور دوسرے کا ابوالنظر الہندی۔ اس کتاب میں پچاس مقامات ہیں اور ہر مقامہ ہندوستان کے کسی بڑے شہر کے نام سے منسوب ہے۔ اس طرح اس میں ہندوستان کے پچاس بڑے شہروں کے حالات، شعری وادبی محاسن، سرسبزی وشادابی۔ وہاں کے باشندوں کے طور طریقے، آداب زندگی، اخلاق وعادات اور محبت وبھائی چارگی کی داستانیں نہایت موثر دل نشیں، آسان اور خوبصورت انداز میں تحریر کی گئی ہیں۔ چند مقامات کے عنوان ملاحظہ ہوں: المقامۃ الثانیۃ وتعرف بالاحمد نگریہ، المقامۃ الثالثۃ وتعرف بالبیجاپوریہ، المقامۃ العاشرۃ وتعرف بالسرھندیہ، المقامۃ الثامنۃ عشر وتعرف بالبنارسیہ المقامۃ الرابعۃ والعشرون وتعرف بالبتنیہ، اس کتاب کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس کا مصنف ہندوستانی ہے۔ جس نے مقامہ نویسی کے لئے اپنے ملک ہندوستان کو موضوع بنایا اور اس ملک کے خوبصورت اور اہم شہروں کے دلکش مناظر اور علمی وادبی واقعات قلم بند کئے جو شاید ہندوستان کی عربی ادب کی تاریخ میں پہلی کوشش ہے۔

اس کتاب کی دوسری خوبی سہل نگاری اور صاف ستھرا اسلوب بیان ہے۔ اس سے قبل ہندوستان کے تمام مدارس میں مقاماتِ حریری یا مقاماتِ بدیع الزماں ہمدانی داخل درس تھیں، جن کی دقت پسندی اور مشکل الفاظ کی کثرت سے یہاں کے معلم و متعلم سبھی لوگ پریشان تھے اور کسی آسان کتاب کی تلاش میں تھے۔ اس لحاظ سے ہم دیکھیں تو مقامات ہندیہ کے مصنف کی یہ کوشش نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ انہوں نے پچھلی روایت سے بغاوت کرکے آسان الفاظ اور عام فہم زبان میں مقامہ نگاری کی بنیاد ڈالی اور آنے والی نسل کے لئے ایک نیا راستہ دکھایا۔ اس کتاب کی تیسری خوبی چھوٹے چھوٹے جملوں اور عام فہم تراکیب کا استعمال ہے۔ جس کی وجہ سے ہر آدمی اس کتاب کو بہ آسانی پڑھ سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے۔

شیخ ابوالفرج محمد فاضل الدین (م ۱۲ ویں صدی ہجری): ہندوستان کے جید عالم اور صوفی ہیں لیکن ان کی زندگی کے حالات و واقعات عام تذکروں میں نہیں ملتے۔

تاہم ان کی ایک قلمی تصنیف شرح القصیدۃ الخمریہ کے نام سے خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ جس کے مطالعہ سے ان کی زندگی کے بعض اہم پہلو معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے مقدمہ میں ہندوستان کے مشہور عالم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (م ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء) کا ذکر اپنے استاد کے جا امجد کی حیثیت سے کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک معزز علمی و دینی گھرانے میں تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ اس سے دوسری اہم بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی چونکہ ۱۱ ویں صدی ہجری کے عالم ہیں اس لئے شیخ ابوالفرج ۱۲ ویں صدی ہجری کے عالم ہوں گے۔

شرح القصیدہ الخمریہ کا ایک قلمی نسخہ خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے لیکن اس کے

علاوہ کسی لائبریری کی فہرست میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے یہ نہایت اہم اور نادر نسخہ ہے۔ مصنف نے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس سے قبل قصیدہ خمریہ کی دو شرحیں فارسی زبان میں لکھیں۔ ایک خم خانہ قادریہ دوسری رموز القادرہ۔ لیکن چونکہ یہ دونوں شرحیں ان کے بلند علمی و ادبی معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے عربی زبان میں ایک تیسری شرح لکھی جس کا نام انہوں نے شرح القصیدۃ الخمریہ تجویز کیا۔ اس شرح کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قصیدۂ خمریہ میں جن قلبی واردات اور عشق رسولؐ کے جن احساسات و جذبات کو پیش کیا گیا ہے ان ہی احساسات و کیفیات کو صوفیانہ اصطلاحات کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ ہر شعر کی بہتر سے بہتر تشریح و توضیح کی گئی ہے اور اسے بڑی خوبصورت اور دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مشہور و معروف صوفیائے کرام کے خیالات بھی تحریر کئے گئے ہیں اس کے علاوہ بعض ایسے صوفیا کے خیالات بھی تحریر کئے گئے ہیں جن سے عام طور پر علمی دنیا واقف نہیں، جیسے ابراہیم اسحاق الوراق النیساپوری، ابوالخیر الاقطع، ابوعلی الثقفی، محمد فضیل البلخی، یحییٰ معاذ الرازی، ابومحمد الحریری، شیخ حمدون القصار وغیرہ۔

شیخ ابوالفرج نے صوفیانہ اسلوب بیان اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس قصیدہ خمریہ کی صوفیانہ حیثیت علمی دنیا کے سامنے آسکے اور علمائے کرام سے داد و تحسین حاصل کرسکے۔ اس سلسلے میں شیخ ابوالفرج ایک جگہ خود ہی فرماتے ہیں:

لما کان فضل اللہ ورحمتہ یختص — جب اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم عام ہے
بھما من یشاء اخصنی بالھام — کہ وہ جس کو چاہے اس سے نواز دے
قدس ذکان علی وفق الاصطلاحات — تو یہ اس کا فضل و کرم ہے کہ اس نے
العرفیۃ وحقائق علی طبق — میرے دل و دماغ پر اچھی باتیں القا کیں

المصطلحات القدسیة بحیث یشبع من تحریرها کل جائع و یستقی من شرابها الصافی کل ظمئی مائع فارجو من الساقی الحقیقی۔

کہ عارفانہ اصطلاحات اور صوفیانہ حقائق کی روشنی میں یہ کتاب لکھوں تاکہ بھوکے کی بھوک مٹ سکے اور ہر صوفی اس کی صاف ستھری شراب سے سیراب ہوسکے۔ مجھے ساقی حقیقی سے امید ہے۔

کتاب کے صوفیانہ و عارفانہ رنگ کا اندازہ اس کے شروع صفحہ کی اس تحریر سے بھی ہوتا ہے:

ھذا کتاب شریف فی شرح القصیدۃ الخمریۃ للشیخ النائب الحقیقی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابی محمد محی الدین سید عبد القادر الجیلی رضی اللہ عنہ، ورد علی قلب ابی الفرح محمد فاضل الدین حفظ اللہ، وارد جذبۃ قدسیۃ لا علم استدلالی لابد للطالب ان یمعن النظر العرفانی فیہ حتی یفوز فوزاً عظیما۔ آمین۔

یہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے قصیدہ خمریہ کی ایک اچھی شرح ہے جو ابو الفرح محمد فاضل الدین کے قلب پر اچھے جذبات و خیالات کی صورت میں وارد ہوئی ہے۔ ایک طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ عارفانہ نظر سے اس کتاب کو پڑھے اور غور و فکر کرے، خدا اسکو بڑی کامیابی کی دولت سے مالامال کرے۔ آمین۔

شیخ ابو الفرح نے اس کتاب کے مقدمہ میں قصیدۂ خمریہ کے صوفیانہ پہلو پر سیر حاصل

گفتگو کی ہے اور لکھا ہے کہ اس قصیدہ کا ہر شعر صوفیانہ حقائق و معارف کا ایک باب ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تعداد اشعار کے بارے میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ ان کے دور میں ہندوستان میں قصیدہ خمریہ کے کل سولہ[۱۶] اشعار دستیاب تھے اور یہی ہر جگہ مروج تھے۔ لیکن جس زمانے میں انہوں نے اس کی شرح لکھنی شروع کی تو حسن اتفاق سے انہیں ایک ایسا نسخہ ملا جس میں انتیس[۲۹] اشعار درج تھے۔ اس کتاب میں انہوں نے ان تمام اشعار کی تشریح و توضیح کی ہے۔

اس کتاب کی دوسری اہم خوبی ادبی تشریح و توضیح ہے۔ مصنف نے اس میں قصیدۂ خمریہ کے تمام مشکل الفاظ کے لغوی معنی بیان کئے ہیں۔ لغت اور محاورہ کے اعتبار سے ہر لفظ کی توضیح کی ہے۔ تمام حل طلب مشکل الفاظ کی صرفی و نحوی ترکیب کرکے اس کو عام فہم اور آسان بنانے کی سعی بلیغ کی ہے۔ اس قصیدہ میں جہاں جہاں فصیح و بلیغ جملے استعمال ہوئے ہیں ان کی نشاندہی کی ہے اور ان کی فصاحت و بلاغت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ قصیدہ کی شعری نزاکتوں، لطافتوں اور ادبی محاسن کی بھی پوری طرح بحث کی ہے۔

یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ بارہویں صدی ہجری کی یہ ایک بہترین یادگار کتاب ہے جو ہماری توجہ اور تحقیق کی محتاج ہے۔

یہ قلمی کتاب ۷۸ اوراق پر مشتمل ہے۔ کتابت ۱۲ ویں صدی ہجری کی ہے لیکن ناقص الآخر ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: اللھم لک الحمد علی ما سقیتنا من کئوس خمور وحدانیتک۔

احمد بن مسعود مہرگامی (بارہویں صدی ہجری) یہ بارہویں صدی ہجری کے اہم علماء میں ہیں[۱]۔

۱؎ ڈاکٹر زبید احمد نے ان کا نام احمد بن مسعود الحسن نگرامی لکھا ہے جو میرے خیال میں صحیح نہیں۔ کیوں کہ خدابخش لائبریری کے قلمی نسخے میں ان کے نام کے ساتھ صاف طور پر مہرگامی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے

لیکن ان کی زندگی کے حالات وواقعات تذکرہ کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ تاہم ان کی ایک قلمی تصنیف باہر البرہان کے نام سے خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے جس میں سالِ تصنیف ۱۱۵۰ھ درج ہے۔ اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ ۱۱۵۰ھ تک زندہ تھے۔ وہ اپنی علمی ودینی خدمات، اخلاق ومحبت اور سماجی تعلقات کی وجہ سے عوام وخواص میں مقبول تھے اور شاہی دربار اور امرا کی محفلوں میں بھی ہردل عزیز تھے۔ انہوں نے تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ ان کے ایک شاگرد اعزالدین احمد اس کتاب باہر البرہان کے کاتب ہیں۔ باہر البرہان دراصل نادرۃ البیان کی شرح ہے۔ شیخ احمد بن مسعود ہرگامی نے پہلے نادرۃ البیان تصنیف کی تھی مگر اسے مشکل خیال کرکے اس کی شرح باہر البیان کے نام سے لکھی۔ جس کا اسلوبِ بیان نہایت آسان اور زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔ یہ کتاب دراصل فنِ نحو پر ہے جو عمدۃ الملک جہاں بہادر ظفر جنگ عالم گیری کے پوتے سید غلام احمد کی تعلیم کے لئے لکھی گئی تھی۔ عمدۃ الملک کا اصل نام میر ملک حسین تھا جو اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ (۱۰۶۸ - ۱۱۱۸ھ) کے رضاعی بھائی تھے۔ یہ ۱۱۰۸ھ میں دکن کے گورنر مقرر کئے گئے تھے۔ ان کی وفات ۱۱۰۹ھ میں ہوئی۔[1] احمد بن مسعود ہرگامی نے باہر البرہان کے مقدمہ میں کتاب کے نام اور سببِ تصنیف کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

وبعد فان العبد الضعیف	بندۂ نحیف احمد بن مسعود حسینی ہرگامی
احمد بن مسعود الحسینی الھرگامی	(معروف بہ ہدیہ) نے ارادہ کیا کہ
المشتھر بالھدیہ ارادان	نادرۃ البیان کے نہج پر ایک کتاب
یحرر نحو نادرۃ البیان لیشرح	باہر البیان کے نام سے تحریر کرے جو
شرحا باھر البیان بعبارۃ	عام فہم اور واضح عبارت میں اس کی
واضحۃ یفھمھا الصبیان	شرح ہو۔ تاکہ طلبہ اس کو بہ آسانی
....	سمجھ سکیں۔۔۔ یہ کتاب دراصل امیر کبیر
... للامیر الکبیر الرفیع الشان	سید غلام احمد خاں بن اعزالدولہ
الولی العلی المکان وھو السید	خاں عالم بہادر بن عمدۃ الملک خاں
العظیم الشان غلام احمد خان	جہاں بہادر ظفر جنگ عالم گیری
ابن اعزالدولہ خان عالم بہادر	سلمہ اللہ کے لئے لکھی گئی ہے۔
بن عمدۃ الملک خان جہاں	
بہادر ظفر جنگ عالم گیری	
سلمہ اللہ تعالیٰ وابقاہ	
واحسن دینہ ودنیاہ وجعل	
ھذا النحو مفادہ ونفعہ فی	
القرآن لبلادہ ومباوءۃ	

خدابخش لائبریری کا نسخہ صحیح اور معتبر ہونے کے اعتبار سے نہایت اہم اور قیمتی ہے۔ کیونکہ اس نسخے کی کتابت مصنف کے شاگرد اعزالدین احمد نے کتاب کی تصنیف کے محض دو سال بعد ۱۱۵۲ھ میں کی تھی۔ وہ ترقیمہ میں لکھتے ہیں:

قد تم بالتحریر فی محرم الحرام	اس کی کتابت محرم الحرام ۱۲۵۲ھ
من الف ومأتین واثنین و	میں مکمل ہوئی۔ اس کے کاتب اور مالک

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۳) صرف نادر البیان کو احمد بن مسعود کی تصنیف کی حیثیت سے ذکر کیا ہے جب کہ باہر البرہان بھی ان کی تصنیف ہے۔ نادر البیان کے بارے میں مزید لکھا ہے کہ اس کا نسخہ اڈنبرا میں محفوظ ہے (دیکھئے عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ، ص ۴۰۸)۔ [1] خدابخش لائبریری کیٹلاگ ۱۵۵/۲۰۔

خمسین من هجرة سید المرسلین	اعزالدین احمد ولد شیخ نجم الدین ہیں
کاتبه ومالکه اعزالدین احمد	جنھوں نے مصنف کے نسخے سے نقل
ولد شیخ نجم الدین نقلته من	کیا ہے اور حتی الامکان صحیح نقل کیا ہے۔
نسخة کتاب المصنف وصححته	
بقدر الامکان۔	

یہ قلمی نسخہ خط نستعلیق میں ہے۔ کہیں کہیں حواشی سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ قلمی کتاب تین اقسام میں منقسم ہے (۱) القسم الاول فی الاسم (۲) القسم الثانی فی الفعل (۳) القسم الثالث فی الحرف۔ ہر مناسب جگہ پر مثالیں پیش کی گئی ہیں کہیں کہیں دو دو تین تین مثالیں تحریر کی گئی ہیں۔ تاکہ طلبہ نحوی مسائل بہ آسانی سمجھ کر ذہن نشین کرسکیں۔ جا بجا قرآنی آیات اور احادیث نبویہ ثبوت کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ فن نحو کے ائمہ (اخفش، کسائی۔ سیبویہ) اور ان کی گراں قدر تصنیفات کے حوالے بھی جا بجا دئے گئے ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے یہ کتاب نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کی ہے۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی (۱۳۱۶ھ/۱۸۹۹ء): یہ ہندوستان کے معروف عالم اور ایک مشہور علمی خانوادے کے مایۂ ناز فرد تھے۔ جو ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اس وقت دہلی میں ایک طرف مولانا مملوک علی نانوتوی (م ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) اور مولانا شاہ اسحاق دہلوی (م ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) دینی علوم و فنون کے لئے مرجع خلائق بنے ہوئے تھے تو دوسری طرف مومن، غالب، صہبائی اور آزردہ اردو و فارسی شعرو ادب

۱؎ خدابخش لائبریری کیٹلاگ ۲۰/۱۵۵۔

کے افق پر آفتاب و مہتاب بن کر چمک رہے تھے۔ مولانا عبدالحق خیرآبادی کے والد بزرگوار مولانا فضل حق خیرآبادی دینی علوم و فنون اور عربی زبان و ادب میں نہایت ممتاز تھے۔ ان کے تعلقات دونوں گروہوں سے نہایت گہرے تھے۔ اس بنا پر مولانا عبدالحق خیرآبادی ان سب سے فیض یاب ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے اور بڑی قلیل مدت ہی میں علم و ادب میں کمال حاصل کرلیا۔ اس درمیان میں ریاست رام پور اور ریاست الور اور ٹونک میں تعلیمی محکمہ کے اونچے عہدوں پر فائز رہے۔ ان کی علمی و انتظامی قابلیت سے ان ریاستوں کے فرمانروا نہایت متاثر ہوئے۔ اس لئے انھوں نے ان کی نہایت قدردانی کی انھوں نے ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۹ء میں خیرآباد میں وفات پائی۔[۱] ان کی تصنیفات میں حاشیہ بر یحییٰ، شرح ہدایت الحکمت، شرح مسلم الثبوت، حاشیہ قاضی مبارک اور التحفۃ الوزیریہ نہایت اہم ہیں۔

التحفة الوزیریہ: یہ مولانا عبدالحق خیرآبادی کی ایک اہم تصنیف ہے جو فن نحو کے مسائل پر ہے۔ اس کے قلمی نسخے صرف دو جگہ ملتے ہیں۔ ایک خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری میں اور دوسرا رضا لائبریری رام پور میں۔ خدابخش لائبریری کا قلمی نسخہ نہایت اہم ہے۔ کیونکہ غالب گمان ہے کہ یہ مصنف کا خود نوشت نسخہ ہے۔ یہ نسخہ دراصل والی ٹونک وزیرالدولہ امیرالملک محمد وزیر خاں نصرت جنگ بہادر کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس لئے مصنف نے اس کا نام التحفة الوزیریہ رکھا۔ چنانچہ اس کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

حررت رسالة فی علم النحو وجعلتها	میں نے علم نحو میں ایک رسالہ تحریر کیا ہے

۱؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۲۷۹، ابجد العلوم ۹۲۴ و تذکرہ کاملان رام پور ص ۱۹۹۔

تحفۃ للجناب القدس المشتہر	جس کو عرب و عجم کے نامور اور صاحب
فی العرب والعجم صاحب السیف	سیف و قلم نواب وزیر الدولہ امیر الملک
والقلم الواصل الی اخص معارج	محمد وزیر خاں بہادر نصرت جنگ کی خدمت
الشوکۃ والحشم البالغ اقصیٰ	میں تحفہ کے طور پر پیش کیا ہے۔
مدارج الخلافۃ والعظمۃ عنی	
النواب وزیر الدولہ امیر الملک	
محمد وزیر خاں بہادر نصرت	
جنگ فی المسائل النحویہ	

یہ نسخہ نہایت سادہ زبان اور عام فہم اسلوبِ بیان میں لکھا گیا ہے تاکہ ہر طرح کے طالب علم اس سے مستفیض ہوں اور اس کا فائدہ عام ہو۔ انہوں نے فنِ نحو کے معروف علماء جیسے سیبویہ، اخفش، کسائی کے حوالے جابجا دئے ہیں۔ تاکہ قاری کے سامنے مدلل انداز میں نحو کے مسائل آسکیں۔ اس کے علاوہ ہر نحوی مسئلے میں مختلف مثالیں تحریر کی ہیں۔ جا بجا قرآنی آیات بھی پیش کی ہیں۔

اس نسخے کے ابتدائی چند اوراق پر حواشی ملتے ہیں جن کے آخر میں منہ عفی عنہ لکھا ہوا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حواشی خود مصنف کے تحریر کردہ ہیں جو غالباً نظرِ ثانی کے وقت انہوں نے خود تحریر کئے ہوں گے۔ یہ نسخہ ۱۹۶ اوراق پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں کتابت ہے۔ تاریخِ کتابت درج نہیں تاہم ۱۳ویں صدی ہجری کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے۔

محمد اسمٰعیل مراد آبادی لندنی (م ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء): ابو محمد المشتاق محمد اسمٰعیل مراد آبادی لندنی ۱۹ویں صدی عیسوی کے مقتدر عالم دین اور عربی زبان کے معروف شاعر و ادیب ہیں۔ مراد آباد کے باشندہ تھے اور وہاں کے ایک علمی و دینی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد کا نام مولانا

وجیہ الدین تھا جو مراد آباد کے بڑے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ محمد اسمٰعیل مراد آبادی بچپن ہی میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ جہاں وہ دینی علوم و فنون سے فراغت کے بعد منصبِ قضا پر فائز ہوگئے تھے عرصۂ دراز تک ان کا قیام لکھنؤ ہی میں رہا۔ اودھ کے نواب نصیر الدین حیدر (۱۲۴۳ھ-۱۲۵۴ھ/۱۸۲۷ء-۱۸۳۷ء) نے ان کے علمی و دینی مقام و مرتبہ کو دیکھتے ہوئے انہیں اپنا سفیر بنا کر لندن بھیج دیا۔ جہاں ایک زمانے تک اقامت پذیر رہے۔ اس بنا پر لندنی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے ایک انگریز خاتون MISS DUFF سے شادی کرلی تھی۔ وہ آزاد خیال تھے لیکن نہایت ذہین و ذکی آدمی تھے۔ دینی علوم و فنون کے علاوہ عربی ادب و شاعری میں کامل دستگاہ رکھتے تھے مولوی تراب علی لکھنوی اور قادر بخش لاہوری ان کے شاگردوں میں تھے۔ انہوں نے ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں وفات پائی[1]

تصنیفات موصوف نے فلسفہ و حکمت، عربی ادب اور لغت میں کئی تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ مثلاً حاشیہ علی شرح التہذیب، حاشیہ علی شرح ہدایۃ الحکمۃ، حاشیہ علی تشریح الافلاک، شرح المقامات الحریری بزبان فارسی القشامات فی شرح المقامات بزبان عربی، تاج اللغات (سات جلدوں میں) تاج اللغات کی تالیف میں ہندوستان کے کئی علماء شریک تھے، لیکن محمد اسمٰعیل لندنی شریک غالب تھے[2]

القشامات یہ مقامات کی ایک اہم عربی شرح ہے۔ مصنف نے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس کی بہت سی شرحیں پڑھیں لیکن ان میں یا تو بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے جس کی وجہ سے اصل متن کا معنی و مفہوم خبط ہوگیا ہے یا طوالت سے کام لیا گیا ہے جس کی وجہ

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۴۱۳۔ نزہۃ الخواطر، ۷/۱، نقوشِ سلیمانی ص ۸۲

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے نزہۃ الخواطر ۷/۱۱۰، تذکرہ علمائے ہند: ۴۱۳، نقوشِ سلیمانی: ۸۲، تاریخ اودھ ۳/۲۹-۳۲۸۔

قاری اصل کتاب کے صحیح معنی ومفہوم سمجھنے سے محروم رہ جاتا ہے۔اور دوسرے مسائل میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔اس لئے مصنف نے اس کی ایسی شرح لکھنے کا ارادہ کیا جو ایجاز واطناب سے خالی ہو، اسی مقصد کے تحت انہوں نے پہلے فارسی زبان میں اس کی ایک شرح لکھی جس کو حسب مطلب نہ خیال کرکے وہ عربی زبان میں ایک دوسری شرح لکھنے کے لئے کمر بستہ ہوئے اور اس کا نام القشامات رکھا۔

یہ شرح کئی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔پہلی بات یہ ہے کہ اس کا اسلوب بیان نہایت عام فہم اور سادہ ہے۔الفاظ، تراکیب اور جملے نہایت آسان استعمال کئے گئے ہیں۔دوسری بات یہ ہے کہ الفاظ کی توضیح وتشریح کے لئے عربی زبان کی اہم اور معتبر لغات سے استفادہ کیا گیا ہے اور جا بجا ان کے حوالے بھی دئے گئے ہیں۔کسی لفظ کے مختلف معنی ہیں تو ان کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ جا بجا قرآنی آیات اور احادیث نبوی بھی پیش کی گئی ہیں جس سے مصنف کی وسعت علم اور دینی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔یہ شرح بلاشبہ مقامات حریری کی اہم شروح میں جگہ پانے کے لائق ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ ایسی اہم تصنیف کا ذکر تذکرہ نگاروں نے نہیں کیا ہے۔مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا عبدالحئی لکھنوی نے محمد اسمٰعیل لندنی کی فارسی شرح کا ذکر تو کیا ہے لیکن اس عربی شرح کا نام تک تحریر نہیں کیا ہے[1]۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مشرقی کتب خانوں کا جائزہ لیجئے تو واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کے کسی کتب خانے میں اس کا کوئی دوسرا قلمی نسخہ موجود نہیں ہے پورے ہندوستان میں صرف خدا بخش لائبریری میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ اس لحاظ سے یہ نسخہ نادر و نایاب اور بڑی اہمیت کا حامل ہے جو ۲۸ ۱۲ اوراق پر مشتمل اور خط نستعلیق میں ہے۔اس کی کتابت محمد اسمٰعیل مرادآبادی لندنی کے شاگرد قادر بخش لاہوری نے ۱۳ ویں صدی ہجری میں کی ہے۔یہ نسخہ المقامۃ الاولی سے شروع ہو کر المقامۃ الخامس والعشرون

[1] دیکھئے نزہۃ الخواطر ۷/۱۔

پر ختم ہوتا ہے۔مصنف نے اس کے ترقیمہ میں خود وضاحت کی ہے کہ یہ مقامات حریری کے نصف اول کی شرح ہے۔اس کے بعد نصف ثانی کی شرح کا خیال تھا لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ مکمل ہوا کہ نہیں۔مصنف کا ترقیمہ ملاحظہ ہو: تقد احسن اللّٰہ جل جلالہ عم نوالہ الینا باتمام شرح النصف الاول من المقامات ونسأل منہ ونتضرع الیہ بان یوفقنا لاختتام شرح النصف الآخر ایضاً۔

اس کے بعد کاتب نے بھی ترقیمہ لکھا ہے جس میں انہوں نے اپنے استاد کے لئے دام ظلہ لکھا ہے۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس نسخے کی کتابت مصنف کی حیات ہی میں ہوئی تھی۔اس لحاظ سے اس نسخہ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔یہ ترقیمہ ملاحظہ ہو: قد تم الکتاب المستطاب لاستاذی الحبر الادیب والعلامۃ الادیب مولانا محمد اسمٰعیل دام ظلہ الظلیل بید العبد الضعیف قادر بخش لاھوری۔ عفی اللہ عنہ۔ وھذا الکتاب المستطاب شرح للمقامات مسمی بالقشامات

محمد مہدی حسن طباطبائی (۱۳ ویں صدی ہجری): یہ تیرہویں صدی کے عالم اور عربی شعروادب کے اچھے فاضل ہیں۔ان کی ایک تصنیف "الدرۃ" ہے جو دراصل منظوم ہے اور جس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔یہ ۔ اوراق پر مشتمل ہے۔

کتاب الدرہ: یہ فقہی مسائل پر ایک منظوم کتاب ہے۔جس کے شروع صفحہ پر ایک [illegible] نظم ہے۔اس سے اس کے متعلق کئی طرح کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کتاب کا نام الدرہ ہے جس کے ناظم محمد مہدی حسن حسینی طباطبائی ہیں۔دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ اس کی کتابت ۱۲۰۵ھ میں ہوئی۔اس سلسلے میں ایک قطعۂ تاریخ بھی درج ہے جو یہ ہے ؎

قیل فارخ قلت قولا صدقا

ارخہ السید فی ما سبقا

شاعر نے اس قلمی کتاب میں نہایت خوبصورت اور دلکش انداز میں مسائل فقہ بیان کئے ہیں۔ فقہی مسائل جیسے خشک موضوع پر نظم کرنا اور دلکش انداز بیان میں انہیں ادا کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سے شاعر کی اعلیٰ شعری لیاقت وصلاحیت ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان کے وہ ایک اچھے اور قادر الکلام شاعر تھے۔ یہ کتاب "القول فی الصیاۃ" سے شروع ہوتی ہے اور "المکروہات وموانع القبول فی الصلوۃ" پر ختم ہوجاتی ہے دیکھئے کتاب کس طرح شروع ہوتی ہے ؎

افتتح المقال بعد البسملۃ ۔۔۔ بحمد خیر منعم والشکر لہ

مصلیا علی نبی الرحمۃ ۔۔۔ وآلہ الاطہار اہل العصمۃ

وبعد فالعلم طویل سلمہ ۔۔۔ شاملۃ افلاکہ وانجمہ

وان علم الفقہ فی العلوم ۔۔۔ کالقمر البازغ فی النجوم

وہذہ منظمۃ فی الفن ۔۔۔ تدخل فی الاذن بغیر اذن

آگے چل کر کتاب کا نام بھی لکھا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

غرا قد وسمتہا بالدرۃ ۔۔۔ تاریخہا عام الشروع غرۃ

اس کے مزید چند اشعار پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ مصنف کی شعری وادبی صلاحیت اور فقہی بصیرت کا اندازہ ہوسکے۔ "السجود" کے زیر عنوان لکھتے ہیں ؎

الفرض فی الرکعۃ سجدتان ۔۔۔ ہما جمیعا احد الارکان

فلو خلت عن السجود بطلت ۔۔۔ صلوتہ ولو بسہو قد خلت

والنقص فی السجدۃ کالزیادۃ ۔۔۔ سہوا بہا لا یفسد العبادۃ

آگے چل کر "الوقت" کا عنوان قائم کرکے جو اشعار کہے ہیں ان میں سے چند ملاحظہ ہوں ؎

الوقت للظہرین بین الخمس ۔۔۔ عن الزوال لغروب الشمس

وللعشائین غروبہا الی ۔۔۔ وقت انتصاف اللیل وقتا جعلا

وخصت الاولی من الفرضین ۔۔۔ بقدرہا من اول الوقتین

وبالاخیر منہما الاخری یخص ۔۔۔ وشرک الباقی باجماع ونقص

وفجر الصبح من طلوع فجر صادق ۔۔۔ الی طلوع الشمس فی المشارق

والکل منہا فلہ وقتان ۔۔۔ للاول الفضل ویجزی الثانی

کیا فروری مہینے کے دن ۲۸ سے بھی کم ہوں گے؟

از جناب ابومجیدہ ابن کریم بخش☆

تعریف موجودہ عالمی عیسوی کلینڈر (CHRISTIAN CALENDAR) پر نظر ڈالتے ہی یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کے سب مہینے تو 30 اور 31 دنوں کے ہیں، لیکن سال کا دوسرا مہینہ فروری کیوں 28 دن ہی کا ہے؟ اگر دنوں کو کم ہی کرنا تھا تو سال کے آخری مہینے دسمبر کے دنوں میں کمی کی جاسکتی تھی، ثانیاً یہ کہ ہر چوتھے سال ایک دن کا اضافہ کرا کے 366 دنوں کا لیپ ایئر (Leap Year) بنایا جاتا ہے اور سب سے کم دنوں والے مہینے فروری میں ایک دن بڑھا کرا کے 29 دنوں کا کر دیا جاتا ہے، ایسا کیوں ہے؟ کمی کی تلافی یا زیادتی میں تخفیف کا اندراج تو آخری مہینے میں ہونا چاہئے تھا نہ کہ دوسرے ہی مہینے میں؟ اس راز کے انکشاف کے لئے موجودہ عیسوی کلینڈر کی توسیع و ترمیم کی تاریخ کا مختصر جائزہ لینا مناسب ہوگا جس سے بالکل ظاہر ہوجائے گا کہ ماضی میں فروری کا دن کیوں گھٹا؟ یعنی فروری کا مہینہ 28 دن کا ہی کیوں ہوا اور مستقبل میں بھی اس کے دن کیسے کم ہوں گے۔ یعنی آئندہ (20,000) بیس ہزارویں سال میں اس کے (یعنی فروری کے) 27 و (1,60,000) ایک لاکھ ساٹھ ہزارویں سال میں اس کے 26 اور (28,80,000) اٹھائیس لاکھ اسی ہزارویں سال میں اس کے صرف 25 دن ہی ہوں گے اور وہ سال صرف (362) تین سو باسٹھ دنوں کا ہی ہوگا۔ یہی سلسلہ ابدالآباد تک جاری رہے گا اگر زمین کا آفتاب کے گرد سالانہ گردش کا وقت 365 دن 5 گھنٹے 48 منٹ اور 45.51 پینتالیس اعشاریہ پانچ ایک سکنڈ ہی رہے۔

☆ نارائن پوروا یا منہاری، کٹھیار، بہار

تاریخ I ۔ البن کلنڈر (Alban Calendar)

موجودہ عالمی عیسوی کلنڈر (Christian Calendar) کی بنیاد رومنوں کے اباء واجداد میں زمانہ ماقبل تاریخ سے رائج البن کلنڈر Alban Calendar ہے جس میں 10 مہینے اور کل 304 دن ہوا کرتے تھے، سال کا آغاز مارٹی اس (Martius) اور انجام ڈی سیم (DICEM) میں ہوا کرتا تھا۔ مہینوں کے نام اس طرح تھے ۔۱۔ مارٹی اس (Martius) ۲۔ اپریلیس (Aprilis) ۳۔ مائی اس (Myius) ۴۔ یونی اس (Unius) ۵۔ کوئنٹلس (Quintilis) ۶۔ سکس ٹی لیس (Sextilis) ۷۔ سپٹیم (Ceptem) ۸۔ آکٹو (Octo) ۹۔ نوویم (Novem) اور ۱۰۔ ڈی سیم (DICEM)

II ۔ رومن کلنڈر (Roman Calendar)

۷۵۳ قبل مسیح میں شہر روما کو اپنے نام پر قائم کرنے والے شہنشاہ رومیولس (Romulus) نے اس شہر کے قیام کے موقع پر 21 اکیس ویں اپریلیس کو البن کلنڈر کے مہینوں کی تاریخوں میں کچھ تبدیلی کرا کے رومن کلنڈر (Roman Calendar) کے نام سے جاری کیا، مہینوں کے نام بھی وہی تھے سال کے دنوں کی تعداد بھی 304 ہی تھی، ابتدا اور انتہا بھی پہلے ہی کی طرح مارٹی اس اور ڈی سیم رہے۔

دنوں کی تعداد مندرجہ ذیل تھی۔

۱۔ مارٹی اس	Martius	31 دن	۲۔ اپریلیس	Aprilis	30 دن
۳۔ مائی اس	Myius	31 دن	۴۔ یونی اس	Unius	30 دن
۵۔ کوئنٹلس	Quintilis	31 دن	۶۔ سکس ٹیلس	Sextilis	30 دن
۷۔ سپٹیم	Septem	31 دن	۸۔ آکٹو	Octo	30 دن
۹۔ نوویم	Novem	31 دن	۱۰۔ ڈی سیم	Dicem	29 دن

III ۔ قمری کلنڈر (Lunar Calendar)

۷۱۳ء قبل مسیح میں شہر روما کے دوسرے بادشاہ نیوماپم پی لی اس

Numapompilius نے جے نوری اس (Januarius) اور فبروری اس (Februarius) نام کے دومہینوں کا اضافہ کرکے رومن کلنڈر کو 10 کی جگہ پر 12 مہینوں والا کلنڈر بنایا اور یونانیوں کی طرح اس کلنڈر کو 354 دنوں والا قمری کلنڈر بنایا۔ اس کلنڈر میں ابتداء کا مہینہ تو حسب سابق رہا لیکن خاتمہ فبروری اس (Februarius) میں ہونے لگا۔ مہینوں کے دنوں کی تعداد تقریباً اس طرح رکھی گئی تھی:۔

۱۔ مارٹی اس	Martius	29دن	۲۔ اپریلیس	Aprilis	30دن
۳۔ مائی اس	Myius	29دن	۴۔ یونی اس	Unius	30دن
۵۔ کوئنٹلس	Quintilis	29دن	۶۔ سکس ٹیلس	Sextilis	30دن
۷۔ سپٹیم	Septem	29دن	۸۔ آکٹو	Octo	30دن
۹۔ نوویم	Novem	29دن	۱۰۔ ڈی سیم	Dicem	30دن
۱۰۔ جے نوری اس	Januarius	29دن	۱۱۔ فبروری اس	Februarius	30دن

IV ۔ شمسی کلنڈر (Solar Calendar)

۲۵۲ قبل مسیح میں رومن کلنڈر کو 355 دنوں والا شمسی کلنڈر بنایا گیا اور سال کے مہینوں کے نام اور دنوں کی تعداد حسب سابق رہی، صرف ایک دن کا اضافہ کیا گیا جس سے دو مہینے لگاتار 30-30 دنوں کے بنائے گئے ہوں گے۔ اس کلنڈر کے مہینوں کا تعلق موسموں سے قائم رکھنے کی غرض سے ہر تیسرے سال ایک زائد مہینہ Inter Calary Month کا اضافہ کرنے کا نظم کیا گیا۔ سال کی ابتدا و انتہا کا دستور حسب سابق مائی اس Martius اور فبروری اس Februarius ہی رہا۔

۴۳۲ قبل مسیح میں یونانی منجم میٹان نے حساب کرکے پتہ لگایا کہ تقریباً $29\frac{1}{2}$ دنوں والے 235 قمری مہینے تقریباً $365\frac{1}{4}$ دنوں والے 19 شمسی سالوں کے برابر ہوا کرتے ہیں، ایک قمری ماہ 29 دن 12 گھنٹے 44 منٹ اور 2.8 سیکنڈ کا ہوا کرتا ہے، اس لئے 235 قمری ماہ

6939 دن 4 گھنٹے 30 منٹ اور 58 سیکنڈ کے اور ایک شمسی سال 365 دن 5 گھنٹے 49 منٹ اور 12 سیکنڈ کا ہوا کرتا ہے، اس لئے 19 شمسی سال 6939 دن 15 گھنٹے 34 منٹ اور 48 سیکنڈ کے برابر ہوتے ہیں اور اسے دور میٹائی Metonic Cycle کہا جاتا ہے۔

V ۔ جولین کلنڈر (Julian Calendar)

۵۴ قبل مسیح میں جولیس سیزر Julius Caesar روم فتح کرنے کے بعد وہاں کا شہنشاہ بنا۔ اس نے رومن کلنڈر کی جانب اپنا خیال مبذول کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کلنڈر کے مہینے موسموں کے ساتھ اپنی نسبت کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ موسموں کے لحاظ سے مہینے بالکل پیچھے رہ گئے ہیں، اس لئے اس نے اس کلنڈر کو درست کرنا چاہا، چنانچہ اپنے منجم سوسی جے نس Socegenes کے مشورے سے 355 دنوں میں 90 دنوں کا اضافہ کرکے 445 دنوں کا مشکوک سال بنایا، مستقبل میں ایسی غلطی سے بچنے کے لئے اس نے سال کی بنیاد آفتاب کے گرد زمین کی سالانہ گردش کے ذریعہ لگا وقت 365 دن اور تقریباً 6 گھنٹوں کو مانا، اضافہ شدہ چھ گھنٹوں کو ہر چوتھے سال 29 دنوں والے سال کے آخری مہینے فروری میں ایک دن کا اضافہ کرکے اسے 29 کی جگہ 30 دن کا اور اس سال کو 365 کی جگہ 366 دنوں والا لیپ ایئر Leap Year بنایا، اس طرح جولیس سیزر Julius Caesar نے رومن کلنڈر کو سائنسی بنیاد پر قائم کرنے کی پوری کوشش کی۔ اسی کے نام پر اب رومن کلنڈر کو جولین کلنڈر کہا جانے لگا اس کلنڈر میں بھی ابتداء کا مہینہ مارٹی اس Martius اور آخری مہینہ فبروری اس Februarius ہی رہا، جولیس سیزر Julius Caesar نے اپنے اس کلنڈر میں ایک تبدیلی اد کی کہ اس کی پیدائش رومن کلنڈر کے پانچویں مہینے کوئنٹلیس Quintilis کی پندرہویں تاریخ کو ہوئی تھی اس نے اس مہینہ کا نام اپنے نام کے مطابق جولین Julius کردیا، اس طرح جولین کلنڈر کے مہینوں کے نام اوران کے دنوں کی تعداد مندرجہ ذیل ہوگئی۔

۱۔ مارٹی اس	Martius	31دن	۲۔ اپریلیس	Aprilis	30دن
۳۔ مائی اس	Myius	31دن	۴۔ یونی اس	Unius	30دن
۵۔ کوئنٹلس	Julyius	31دن	۶۔ سکس ٹیلس	Sextilis	30دن

۷۔ سیپٹم Septem 31 دن ۸۔ آکٹو Octo 30 دن
۹۔ نوویم Novem 31 دن ۱۰۔ ڈی سیم Dicem 30 دن
۱۰۔ جےنوری اس Januarius 31 دن ۱۱۔ فبروری اس Februarius 29 دن

کل 365 دن جسے ہر چوتھے سال 366 دنوں کا لیپ ایئر Leap Year بنایا جانے لگا، جولین کلنڈر ۴۶ قبل مسیح میں منظر عام لایا گیا۔

۴۴ قبل مسیح میں آگسٹس سیزر Augustus Caesar جولیس سیزر کے مرنے کے بعد روم کا شہنشاہ بنا۔ کچھ دنوں تک حکومت کرنے کے بعد اسے پتہ چلا کہ ہر چوتھے سال میں ایک دن کے اضافہ کا جو قاعدہ جولیس سیزر بنا تھا، وہ پادریوں کے دست برد سے جن کے ذمہ کلنڈر کا نظم ونسق تھا، یہ اضافہ ہر تیسرے سال کیا جانے لگا ہے، نتیجتاً 4 دنوں کی زیادتی ہوگئی ہے۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ آئندہ 12 سالوں تک اضافہ کو روک دیا جائے، اس کے بعد جولیس سیزر کے قاعدے کے مطابق ہی اضافہ ہر چوتھے سال کیا جائے۔ اس طرح آگسٹس سیزر نے پھر ایک بار کلنڈر کو قدرتی قاعدے کے مطابق کردیا لیکن اس نے بھی اس میں کچھ تبدیلی کردی، وہ یوں کہ جب اسے پتہ چلا کہ جولیس سیزر نے رومن کلنڈر کے پانچویں مہینے کونٹلس کو اپنے نام پر جولیس کردیا ہے تو اس نے بھی چھٹے سکس ٹیلس Sextilis کو جس میں اسے فتح وکامرانی حاصل ہوئی تھی اور جسے وہ متبرک خیال کرتا تھا، اپنے نام کے موافق آگسٹس کردیا اور اس خیال سے کہ اس کے نام کا مہینہ جولیس سیزر کے نام کے مہینے سے چھوٹا کیوں رہے، سال کے آخری مہینے فبروری اس Februarius سے ایک دن نکال کر اپنے نام کے مہینے آگسٹس Augustus کی تعداد بھی 30 کی جگہ 31 دنوں کی کردی، اس طرح فبروری اس کے دنوں کی تعداد 29 کی جگہ 28 رہ گئی۔ اس طرح لگاتار جولیس آگسٹس اور سیپٹم 31-31 دنوں کے ہوگئے۔ اس گڑبڑی کو دور کرنے کے لئے مہینوں کے دنوں میں مندرجہ ذیل طرح کا نظم کیا گیا۔

۱۔ مارٹی اس Martius 31 دن ۲۔ اپریلیس Aprilis 30 دن
۳۔ مائی اس Myius 31 دن ۴۔ یونی اس Unius 30 دن

۵۔ جولیس Julius 31 دن ۶۔ آگسٹس Augustus 31 دن
۷۔ سیپٹم Ceptem 30 دن ۸۔ آکٹو Octo 30 دن
۹۔ نوویم Novem 30 دن ۱۰۔ ڈی سیم Dicem 31 دن
۱۱۔ جےنوری اس Januarius 31 دن ۱۲۔ فبروری اس Februarius 28 دن

آگسٹس سیزر کے بعد ابھی تک مہینوں کے دنوں کی تعداد وہی ہے اور لیپ ایئر ہر چوتھے سال میں ہوا کرتا ہے، لیکن سال کے دنوں کی تعداد موقع بموقع گھٹائی گئی ہے۔

۳۲۵ء عیسوی میں فرانس کے شہر نائس Nice میں علمائے ریاضی اور منجموں کی ایک نشست ہوئی جس میں جولین کلنڈر کے ذریعہ بنایا گا زمین کی سالانہ گردش 365 دن تقریباً 6 گھنٹوں کا موازنہ سالانہ گردش کے صحیح وقت 365 دن 5 گھنٹے 49 منٹ اور 12 سکنڈ سے کرنے پر پتہ چلا کہ جولین کلنڈر کا ایک سال صحیح سال سے دس منٹ ۴۸ سکنڈ آگے بڑھ جاتا ہے جس سے آئندہ چل کر کلنڈر میں غلطی در آئے گی۔ مذکورہ در سے ابھی تک یعنی ۳۲۵ء میں یہ اضافہ 54 گھنٹے اور 36 منٹ ہوگیا ہے، اس لئے فوری طور سال مذکور میں دو دنوں کی کمی کا فیصلہ کیا گیا اور اس پر عمل کرنے کے لئے اسی دن 23 مارچ کو 25 مارچ دو دن گھٹا کر کردیا گیا، واضح رہے کہ اس وقت کی صحیح تحقیق کے ذریعہ یونانیوں اور ہندوستانیوں کے سائنس اصول کے ماننے والوں میں زمین کا آفتاب کے گرد سالانہ گردش کا صحیح وقت 365 دن 5 گھنٹے 49 منٹ اور 12 سکنڈ ہی تصور کیا جاتا ہے۔ جو حسب حال اب تک چلا آرہا ہے۔

VI۔ عیسوی کلنڈر (Christian Calendar)

جولین کلنڈر اپنی ابتدا ۴۶ قبل مسیح سے ۵۴۸ عیسوی تک جاری رہا، اسی سال یعنی ۵۴۸ عیسوی میں ایک رومن پادری ڈایونی سی اس ایکس گیو اس Dionysus Exiguus نے موجودہ تاریخی کتب اور دیگر ذرائع کی مدد سے حضرت عیسی مسیح کی پیدائش سے گذرے ہوئے ایام کی تعداد نکال کر حضرت مسیح کے سال پیدائش سے عیسوی کلنڈر کو رائج کیا۔ اس کلنڈر کی ساری باتیں جولین کلنڈر کے مطابق رکھی گئیں۔ سال کی ابتدا مارٹی اس Martius سے اور انتہا

فروری اس سے ہوتی تھی لیکن بہت دنوں تک عیسوی کلنڈر عیسائی دنیا میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکا کیوں کہ مسیحی علما مانتے تھے کہ حضرت عیسی مسیح کی تاریخ پیدائش نکالنے میں ڈایونی سی اس ایکس گیواس نے بھول کی ہے، حضرت مسیح کی تاریخ پیدائش 4 اپریلیس Aprilis ۴ قبل مسیح مانا جاتا ہے، دھیرے دھیرے یہ کلنڈر عیسائی دنیا میں مقام بنانے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈایونی سی اس ایکس گیواس Dionysus Exiguus نے ہی جولین Julian کلنڈر کے مہینوں کے نام کو انگریزی شکل دے کر مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر، جنوری اور فروری بنایا۔ اس کلنڈر کو جولین کرسچین کلنڈر Julian Christian Calendar یا طریقہ قدیم Old Style کہا جاتا ہے۔

VII۔ گریگورین کلنڈر (Gregorian Calendar)

۱۵۸۲ عیسوی میں روم کے تیرہویں پوپ گریگوری نے عیسوی کلنڈر کے $365\frac{1}{4}$ دنوں کے سال کا موازنہ حقیقی گردش سالانہ کے وقت 365 دن 5 گھنٹے 49 منٹ اور 12 سکینڈ سے کیا تو پتہ چلا کہ ہر سال عیسوی کلنڈر کے ذریعہ 10 منٹ اور 48 سکینڈ زیادہ استعمال کیا جارہا ہے جیسا کہ ناظرین ۳۲۵ عیسوی کی نائس شہر کی نشست میں دیکھ چکے ہیں، ایسے ہی اضافہ کی اطلاع دیتے ہوئے رومن پادری وینے ریبل بیڈ Venrable Bede نے بھی کہا تھا کہ ہر ایک 128 سال میں ایک دن کا زیادہ استعمال ہورہا ہے جسے کم کرنا پڑے گا۔

گریگوری نے 365 دن 6 گھنٹے کو 400 سے ضرب کیا حاصل ضرب 1,46,100 ایک لاکھ چھیالیس ہزار ایک سو دن ہوا اور 365 دن 5 گھنٹے 49 منٹ اور 12 سکینڈ کو 400 سے ضرب دیا تو حاصل ضرب 1,46,097 ایک لاکھ چھیالیس ہزار ستانوے دن ہوا اس طرح اسے پتہ چلا کہ طریقہ قدیم کے ذریعہ چارسو سال میں تین دن زیادہ استعمال کیا جارہا ہے۔ نائس نگر کی 325 عیسوی کی نشست سے تا حال اکتوبر ۱۵۸۲ عیسوی تک کل 10 دنوں کی زیادتی ہوگئی ہے، اس خیال سے اس نے نیپلس کے منجم ایلائے سی اس لی لی اس Aloysius Lilius کے مشورے سے فوراً 5 اکتوبر ۱۵۸۲ء جمع کو 15 اکتوبر ۱۵۸۲ء جمع کردیا، اتنا ہی نہیں سال کا

آغاز مارچ کی جگہ جنوری سے اور انجام فروری کی جگہ دسمبر سے کرنے کا حکم جاری کیا، لیپ ائیر Leap year میں جو اضافہ فروری سال کے آخری مہینے میں ہوا کرتا تھا، طریقہ جدید میں دوسرے مہینے میں ہی ہونے لگا، مہینہ کا مقام بدلا لیکن نام بدستور قائم رہا، ساتھ ہی گریگوری نے یہ قاعدہ بنایا کہ آئندہ سے صدی کا مکمل سال جو 400 چارسو سے منقسم ہوگا وہی لیپ ائیر ہوگا اس لئے 1700، 1800، 1900 صدی کا مکمل سال گرچہ طریقہ قدیم کے مطابق لیپ ائیر ہونا چاہئے تھا لیکن طریقہ جدید کے ذریعہ 400 سے منقسم نہیں ہونے کے سبب لیپ ائیر نہیں بنایا گیا تھا، ہاں آئندہ آنے والا 2000 دو ہزارویں صدی کا مکمل سال جو کہ 400 چارسو سے پورے کا پورا تقسیم ہوجائے گا اس لئے وہ لیپ ائیر ہوگا۔ اس سے آگے 2100، 2200 اور 2300 صدی کا مکمل سال لیپ ائیر طریقہ بالا کے سبب نہیں ہوگا۔ گریگوری کے ذریعہ کئے گئے عیسوی کلنڈر میں ترمیم کے سبب اسے گریگورین کلنڈر Gregorian Calendar یا طریقہ جدید کہا جاتا ہے۔

اس طریقہ کے مطابق مہینہ اوران کے دن درج ذیل ہیں

ماہ	Month	دن	ماہ	Month	دن
۱۔جنوری	January	31دن	۲۔فروری	February	28دن
۳۔مارچ	March	31دن	۴۔اپریل	April	30دن
۵۔مئی	May	31دن	۶۔جون	June	30دن
۷۔جولائی	July	31دن	۸۔اگست	August	31دن
۹۔ستمبر	September	30دن	۱۰۔اکتوبر	October	31دن
۱۱۔نومبر	November	30دن	۱۲۔دسمبر	December	31دن

گریگوری کے ذریعہ ترمیم شدہ عیسوی کلنڈر Christian Calendar طریقہ جدید یا New Style کو 1582ء میں اٹلی، فرانس، اسپین اور پرتگال نے 1583ء میں پرشیا، جرمنی سوئزرلینڈ، ہالینڈ اور فلینڈر اس نے 1586ء میں پولینڈ نے 1857ء میں ہنگری نے 1700ء میں نیدرلینڈ اور ڈنمارک نے اور 1752ء میں برٹش حکومت نے طریقہ قدیم Old

Style میں یعنی Christian Calendar میں 11 دنوں کی کمی کر کے بدھ 3 ستمبر 1752ء کو
جمعرات 14 ستمبر 1752ء بنا کر اپنایا اسی سال سے برٹش حکومت میں جنوری کو سال کا پہلا مہینہ اور
دسمبر کو سال کا آخری مہینہ مانا جانے لگا۔ ہندوستان میں بھی اسی وقت سے اس کا رواج ہوا، مذکورہ
طریقہ جدید New Style کو 1872ء میں جاپان نے 1912ء میں چین نے 1915ء میں بلغاریہ
نے 1917ء میں ٹرکی اور سوویت یونین نے اور 1919ء میں یوگوسلاویہ اور رومانیہ نے اپنایا۔

VII ۔ مستقبل میں ہونے والی ترمیمیں (Amendments in Future)

ناظرین پہلے ملاحظہ کر چکے ہیں کہ گریگوری نے زمین کی آفتاب کے گرد سالانہ گردش میں لگے
وقت 365 دن 5 گھنٹے 49 منٹ اور 12 سکینڈ کو اپنی تحقیق و ترمیم کی بنیاد بنایا تھا لیکن دور جدید
میں سائنسی آلات کے ذریعہ گردش سالانہ کے وقت کو صحیح صحیح ناپ لیا گیا ہے اور علماء ریاضی اس
وقت کو 365 دن یا پانچ گھنٹے 48 منٹ اور 46 سکینڈ مانتے ہیں۔ اس طرح طریقہ جدید سے
ہر سال صحیح سال سے 26 سکینڈ آج بڑھ جاتا ہے اس لئے علماء خیال کرتے ہیں کہ اس کا اثر چار
ہزارویں سال پر پڑے گا۔ زیادتی تقریباً ایک دن کے برابر ہو جائے گی اور طریقہ قدیم و جدید
کے مطابق چار ہزارواں سال لیپ ایئر ہونا چاہئے لیکن ایک دن کی زیادتی کے سبب اسے لیپ
ایئر نہ مانا جائے گا بلکہ وہ 365 دنوں کا عام سال ہی ہوگا۔

۱۔ چار ہزارواں سال لیپ ایئر نہیں پہلے گذر چکا ہے کہ علما کے خیال میں چار ہزارواں
سال لیپ ایئر نہیں ہوگا، میرے خیال میں حقیقتاً نہیں ہوگا۔ اتنا ہی نہیں آگے فروری کے 28 کے
بجائے 26،27 اور 25 دن ہی ہوں گے ایسا کیوں اور کیسے ہوگا حساب آگے آرہا ہے۔

کیرالا سے شائع ہونے والا منورما ایر بک میں سالانہ گردش کا صحیح صحیح وقت 365 دن 5
گھنٹے 48 منٹ اور 45.51 پینتالیس اعشاریہ پانچ ایک سکینڈ درج ہے، ممکن ہے علما نے 45.51
سکینڈ کو پورا 46 سکینڈ مان لیا ہو اور اسی کی بنیاد پر حساب کیا ہو، لیکن میں نے 45.51 سکینڈ کو ہی
بنیاد مان کر اپنی تحقیق کی ہے جسے اہل علم ونظر کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

24 گھنٹوں کے ایک دن میں 60x60x24 برابر 86,400 چھیاسی ہزار چار سو
سکینڈ ہوتے ہیں اور 365 دن 5 گھنٹے 49 منٹ اور 12 سکینڈ میں 365 دن 5 گھنٹے 48

منٹ اور 45.51 سکینڈ تفریق کرنے سے 26.49 چھبیس اعشاریہ چار نو سکینڈ باقی بچے ہیں۔
اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر سال طریقہ جدید کے ذریعہ ۱؎ عیسوی سے ہی چھبیس اعشاریہ
چار نو سکینڈ کا زیادہ استعمال ہوتا آرہا ہے جو کہ ایک عرصہ دراز یعنی اٹھائیس لاکھ اسی ہزار سالوں میں
883 دن ہو جائے گا۔ اس طرح موجودہ طریقہ جدید والے کلینڈر میں آئندہ کوئی بھی چار ہزارواں
سال لیپ ایئر نہیں ہوگا۔ حساب کچھ اس طرح ہے 26.49 چھبیس اعشاریہ چار نو
سکینڈ ضرب 4000 برابر 1,05,960 ایک لاکھ پانچ ہزار نو سو ساٹھ سکینڈ جس میں ایک دن کے
چھیاسی ہزار چار سو سکینڈ تفریق کرنے پر 19,560 سکینڈ باقی بچتے ہیں جسے آئندہ منہا کیا جانا
چاہئے۔ اس طرح چار ہزارویں سال کو لیپ ایئر نہیں بنا کر اضافہ شدہ وقت کو منہا کرنا پڑے گا۔

۲۔ فروری کے 27 دن چار ہزار سالوں میں سالانہ 26.49 چھبیس اعشاریہ چار نو
سکینڈ کا اضافہ منہا کرنے کے بعد بھی 19,560 انیس ہزار پانچ سو ساٹھ سکینڈ باقی بچے رہے
جسے آئندہ 20,000 ویں ہزارویں سال میں منہا کرنا پڑے گا، چونکہ 4000 چار ہزار سالوں
میں کل 19,560 انیس ہزار پانچ سو ساٹھ سکینڈ باقی بچتے ہیں اس لئے 20,000 بیس ہزار
سالوں میں $\frac{\overset{5}{\cancel{20,000}} \times 19,560}{\cancel{4000}} = 97,800$ ستانوے ہزار آٹھ سو سکینڈ ہوتے
ہیں جس میں سے ایک دن کے 86,400 چھیاسی ہزار چار سو سکینڈ تفریق کرنے پر 11,400
گیارہ ہزار چار سو سکینڈ بچتے ہیں جسے آئندہ ایک لاکھ ساٹھ ہزارویں سال میں ادا کیا جانا چاہئے،
اس لئے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ آئندہ آنے والے ہر بیس ہزارویں سال میں چار ہزارویں سال
کا اک دن اور بیس ہزارویں سال کا ایک دن کل دو دن کم کر کے فروری کے 27 دن ہی رکھے
جائیں گے، پس ثابت ہوا کہ بیس ہزارویں سال میں فروری ستائیس دنوں کا مہینہ رہ جائے گا۔

۳۔ فروری کے 26 دن بیس ہزارویں سال میں ایک دن منہا کرنے
کے بعد بھی 11,400 گیارہ ہزار چار سو سکینڈ باقی بچے رہے جسے آئندہ 1,60,000 ایک لاکھ
ساٹھ ہزارویں سال میں منہا کرنا پڑے گا، چونکہ 20,000 بیس ہزار سالوں میں
11,400 گیارہ ہزار چار سو سکینڈ بچتے ہیں، اس لئے 1,60,000 ایک لاکھ ساٹھ ہزار سالوں

میں $\frac{1,60,000\times 11,400}{20000}$ 8 برابر (91200) اکیانوے ہزار دو سو سکینڈ ہوتے ہیں
جس میں سے ایک دن کے برابر 86,400 چھیاسی ہزار چار سو سکینڈ تفریق کرنے پر باقی
4,800 چار ہزار آٹھ سو سکینڈ بچتے ہیں، جسے آئندہ 28,80,000 اٹھائیس لاکھ اسی ہزارویں
سال میں منہا کرنا پڑے گا۔ ناظرین سمجھ گئے ہوں گے ایک لاکھ ساٹھ ہزارویں سال میں چار
ہزارواں سال والا ایک دن بیس ہزارواں سال والا ایک دن اور خود ایک لاکھ ساٹھ ہزارواں سال
والا ایک دن اسی طرح 29 دنوں میں 3 دن وضع کرنے پڑیں گے اور فروری کے 26 دن ہی
رکھنے پڑیں گے۔

۴۔ فروری کے 25 دن ایک لاکھ ساٹھ ہزارویں سال میں منہا کرنے کے بعد بھی
4,800 چار ہزار آٹھ سو سکینڈ باقی بچے ہیں جسے آئندہ 28,80,000 اٹھائیس لاکھ اسی ہزارویں
سال میں ہنسا کرنا پڑنے گا چونکہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار سالوں میں 4,800 چار ہزار آٹھ سو
سکینڈ باقی بچتے ہیں اس لئے 28,80,000 اٹھائیس لاکھ اسی ہزار سالوں میں ---------
--- $\frac{28,80000\times 4,800}{1,60,000}$ 18 برابر 86,400 چھیاسی ہزار چار سو سکینڈ جو بالکل ایک
دن کے برابر ہے، اس لئے اٹھائیس لاکھ اسی ہزاروں سال میں کل چار ہزارواں سال والا ایک
دن، بیس ہزارواں سال والا ایک دن، ایک لاکھ ساٹھ ہزارواں سال والا ایک دن اور خود
اٹھائیس لاکھ اسی ہزارواں سال والا ایک دن یعنی کل چار دن گھٹانے پڑیں گے یعنی 29 تفریق
4 برابر 25 دن ہی رہ جائیں گے اور وہ سال ضرب 362 دنوں کا ہی ہوگا۔ یہی سلسلہ ابدالآباد
تک جاری رہے گا، اگر زمین کی سالانہ گردش کے وقت میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔

۵۔ خاتمہ کلام 26.49 چھبیس اعشاریہ چار نو سکینڈ کے ۱ ء سے سالانہ اضافے
کے مختلف سالوں میں تکمیل کے حساب کو مندرجہ ذیل طریقے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے، چونکہ
سالانہ اضافہ 26.49 چھبیس اعشاریہ چار نو سکینڈ ہے۔ اس لئے یہ اضافہ 28,80,000
اٹھائیس لاکھ اسی ہزار سالوں میں 26.49 × 28,80,000 برابر 7,62,91,200 سکینڈ
یعنی سات کروڑ باسٹھ لاکھ اکیانوے ہزار دو سو سکینڈ ہوتے ہیں جس میں ایک دن کے برابر

86,400 چھیاسی ہزار چار سو سے تقسیم دینے پر کامل 883 آٹھ سو تراسی دن ہوتے ہیں۔
ناظرین پہلے پڑھ آئے ہیں کہ ہر چار ہزارویں، بیس ہزارویں، ایک لاکھ ساٹھ ہزارویں اور
اٹھائیس لاکھ اسی ہزارویں سال میں کمیاں کرنی پڑتی ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ مندرجہ بالا سات
کروڑ باسٹھ لاکھ اکیانوے ہزار دو سو سکینڈ کے کل 883 آٹھ سو تراسی دن چار ہزار، بیس ہزار،
ایک لاکھ باسٹھ ہزار اور اٹھائیس لاکھ اسی ہزار سالوں میں کتنی کتنی بار شامل ہیں۔

28,80,000÷4000 =720 دن

28,80,000÷20,000 =144 دن

28,80,000÷1,60000 =18 دن

28,80,000÷28,80,000 =1 دن

اب بالکل واضح ہوگیا ہے کہ اٹھائیس لاکھ اسی ہزار کے دور میں چار ہزار کل سات سو
بیس بار، بیس ہزار کل ایک سو چوالیس بار ایک لاکھ ساٹھ ہزار کل اٹھارہ بار اور اٹھائیس لاکھ اسی ہزار
صرف ایک بار ہی شامل ہے۔ ''واللہ اعلم بالصواب''

مختلف تقاویم: موجودہ عالمی عیسوی کلینڈر کئی طرح سے 16"x18" سائز پر تیار کیا گیا
ہے جسے بڑی آسانی سے Wall Calender کی طرح استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ ترکیب
استعمال بہت آسان ہے جو کلینڈروں پر تحریر شدہ ہے۔ ان کلینڈروں کے ذریعہ ماضی، حال و
مستقبل کی تاریخوں کے دن اور دنوں کی تاریخیں معلوم کی جاسکتی ہیں:۔

(۱) جولین کلینڈر: یہ عیسوی کلینڈر میں تبدیل کیا گیا ہے جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے جس کا
آغاز مارچ اور خاتمہ فروری میں ہوا کرتا تھا۔ اس کلینڈر سے انگلینڈ اور ہندوستان وغیرہ ممالک
میں ۳/ستمبر 1752ء سے قبل کی تاریخوں کے دن وغیرہ معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

(۲) گریگورین کلینڈر: (الف) : چار ہزار سالہ کلینڈر۔ اس کے ذریعہ ۱۵/اکتوبر
1952ء سے چار ہزار عیسوی تک کی تاریخوں کے دن وغیرہ معلوم کئے جاسکتے ہیں، چونکہ عاجز کی
یہ تحقیق کہ چار ہزارواں سال لیپ ایئر Leap Year نہیں ہوگا۔ یہ کلینڈر 31/دسمبر 4000ء

تک چلے گا، اگر عاجز کی یہ تحقیق سامنے نہیں آتی تو یہی دائمی عیسوی کلینڈر رہوتا۔

(ب) **بیس ہزار سالہ کلینڈر :** اس کا بھی استعمال بڑی آسانی سے تھوڑی سی زحمت سے کیا جاسکتا ہے۔ گریگورین اصول کی بنیاد اور میری معتبر تحقیق کے مطابق اس کا استعمال 15/اکتوبر 1952ء سے 31/دسمبر 20000ء تک ہوسکے گا۔

(ج) **ایک لاکھ ساٹھ ہزار سالہ کلینڈر:** مذکورہ تحقیق کی بنیاد پر یہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار سال تک چلتا رہے گا، جس میں ہر بیس ہزارویں سال میں ایک دن فروری سے کم کرنے کی گنجایش رکھی گئی ہے۔

(د) **اٹھائس لاکھ اسی ہزار سالہ کلینڈر :** یہ بھی مذکورہ اصول پر تیار کیا گیا ہے۔

روزمرہ کے استعمال کے لئے چار ہزار سالہ اور بیس ہزار سالہ کلینڈر عام فہم اور آسان ہے، بقیہ کلینڈر تو صرف عجائب گھروں میں مستقبل کے لئے رکھے جاسکتے ہیں۔

﴿ ماخذ ﴾

(۱) رحمت للعلمین :۔ قاضی سلیمان منصور پوری۔
(۲) جیوتی گنت کومودی :۔ شری رجنی کانت شاستری، گنگا وشنو شری کرشن داس پرکاش کلیان، بمبئی۔
(۳) علم جیوتش کی دوسری کتاب :۔ پنڈت رگھوناتھ داس جیوتش۔ پنڈت گردھاری لال منجم د جھار، سیال کوٹی اینڈ سنس، پوسٹ بکس نمبر ۱۵۹، دہلی۔
(۴) چلڈرن نالج بنک حصہ اول :۔ ڈاکٹر سنیتا گپتا اور ڈاکٹر پنیتا اگروال پستک محل، دہلی-۶
(۵) مہان اوشکار :۔ راجندر کمار راجیو پستک محل، دہلی۔
(۶) وگیان پرگتی :۔ جنوری ۱۹۹۴ء انل کمار راٹھور کا مضمون کلینڈر کتنا حسابی اور تاریخی۔
(۷) ہمارا اردو ڈائجسٹ:۔ سالنامہ فروری ۱۹۷۲ء ہاشم سلطانپوری کا مضمون۔
(۸) خدا بخش لائبریری لکچرس انڈین اینڈ اسلامک I
(۹) Comparative Tables of Islamic and Christian Dates
(۱۰) منورما ایر بک ۱۹۹۶ء۔

استفسار و جواب

ابوالحسن تاناشاہ

احسان اللہ احمد چشتی } عہد عالم گیری کے مشہور انشا پرداز، صاحب طرز نثر نگار اور خوش فکر شاعر نعمت خاں عالی نے گول کنڈہ کے آخری فرمانروا ابوالحسن حیدرآبادی تاناشاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی نمک حرامی کی بنا پر اورنگ زیب عالم گیر نے ملازموں سمیت اسے قید کردیا تھا، چنانچہ اس کی عمر کے بقیہ مستعار لمحات ناکامی میں گزرے لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ تاناشاہ ایک صوفی مسلک، پاک باز اور بے نیاز بادشاہ تھا، اس کا سلسلہ آمریت سے جوڑنا بالکل غلط ہے، تاناشاہ اور نادرشاہ میں فرق ہے مگر اب ہندی میں تاناشاہی کا لفظ ڈکٹیٹرشپ کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا ہے۔

اس بارے میں معارف کی کیا رائے ہے؟

معارف : تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ شاہ دکن عبداللہ قطب شاہ کے اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس کے تین بیٹیاں تھیں جن میں سے ایک بیٹی ابوالحسن تاناشاہ سے منسوب ہوئی۔ شادی سے قبل تاناشاہ کی زندگی درویشانہ تھی، وہ سید راجو کا مرید تھا، شادی کے بعد بھی اپنی خوش خلقی، نرمی و رواداری کے سبب وہ امرا و اعیان سلطنت میں جلد ہی مقبول ہوگیا۔ (سیر المتاخرین، ج ۱ ص ۴۵۰) عبداللہ قطب شاہ کی رحلت کے بعد تاناشاہ اپنے معاونین اور خیر خواہوں کی بہ دولت تخت سلطنت پر متمکن ہوگیا۔ اس زمانے میں حکومت و سلطنت اپنے وزرا کے ہاتھوں میں دے کر خود عیش و نشاط میں غرق ہوگیا، مآثر الامرا کا مصنف جو ابوالحسن

تاناشاہ کا طرف دار ہے۔ فتح حیدرآباد کے حال میں لکھتا ہے" ابوالحسن والی تلنگانہ نے انتہائی عیش پرستی کی وجہ سے پندرہ سال کی حکومت میں بھی حیدرآباد سے باہر قدم نہیں رکھا، بہ جز اس کے کہ گول کنڈہ گیا تھا جو حیدرآباد سے ایک کوس کے فاصلہ پر ہے (ج ا ص ۵۳۶ بحوالہ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، طبع جدید ۱۹۹۹ء ص ۷)

خافی خاں نے لکھا ہے کہ "تاناشاہ کی عیش پرستی کی وجہ سے حیدرآباد کی ریاست مادنا اور آکنا پنڈت کے ہاتھوں میں تھی اور وہی سیاہ و سفید کے مالک تھے، یہ سخت متعصب تھے، ان کی عصبیت کی وجہ سے مسلمانوں پر ہر قسم کے مظالم روا رکھے جاتے تھے علانیہ فسق و فجور، لہو و لعب اور شراب خوری ملک میں عام تھی" (منتخب اللباب ج ۲ ص ۲۹۲، ۲۹۳) اس سے قطع نظر اس کے عہد حکومت میں رفاہی کام بھی انجام پائے۔

مگر اس کے صوفی المشرب ہونے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ غیر ملکی سیاحوں نے جو عموماً غیر جانب دار ہوتے ہیں بھی اس کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ فرایر لکھتا ہے کہ ابوالحسن عیاشیوں میں غرق رہتا تھا اور اس طریقے سے اس نے اپنے کو غفلت میں رکھنے کی کوشش کی (جلد ا ص ۸۵ بحوالہ تاریخ گولکنڈہ ص ۲۵۰)

سیاحوں اور مورخین کے مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تاناشاہ صوفی مسلک اور پاک باز تھا اور نہ ہی وہ ڈکٹیٹر اور مطلق العنان حاکم تھا کیونکہ اس نے تو امور سلطنت اپنے وزراء و اعیان حکومت کے حوالے کر دیے تھے اور خود غفلت میں سرشار رہتا تھا، اگر وہ مطلق العنان، آمر یا ڈکٹیٹر بادشاہ ہوتا تو اس کی آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کے واقعات تاریخوں میں مذکور ہوتے۔

نعمت خاں عالی ابتدا میں تو ابوالحسن کا ہمدرد نظر آتا ہے، تسخیر گولکنڈہ کے

بعد اس نے حیدرآباد اور گولکنڈہ کے جو حالات و واقعات لکھے ہیں وہ ان کا عینی شاہد ہے اس لئے اس کا بیان صحیح و مستند معلوم ہوتا ہے۔

اردو زبان میں تاناشاہ انتہائی نازک مزاج اور نازک دماغ شخص کے لئے بولا جاتا ہے اور اس کی نسبت ابوالحسن تاناشاہ ہی کی طرف کی گئی ہے۔ تاہم ہندی میں تاناشاہی ڈکٹیٹر شپ کے معنی میں ضرور مستعمل ہے اور ہندی والے اس کو ہندی لفظ بتا کر اس کے یہ معنی لکھتے ہیں "ایسا حاکم یا بادشاہ جس کو کسی کی باز پرس کا کوئی خوف نہ ہوا اور جو اپنی من مانی کرتا ہو"۔

تاہم یہ امر تحقیق طلب ہے کہ ہندی زبان میں یہ لفظ موجودہ مروجہ مفہوم میں کب سے اور کیوں استعمال ہوا؟

کلیم صفات اصلاحی

معارف کی ڈاک

کھلا خط

۲ مئی/ ۲۰۰۲ء

مکرم و محترم اصلاحی صاحب ! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

مزاج گرامی !

ایک عرصہ سے آپ کو خط نہیں لکھ سکا ہوں معارف ملتا ہے تو سمجھتا ہوں خیریت مل گئی اپریل کا شمارہ مل گیا۔ شذرات صفحہ ۲۴۴ کے پہلے پیراگراف کے پیش نظر یہ کھلا خط ارسال خدمت ہے۔ جس کلچر کا اس میں ذکر ہے وہ "سیاسی کلچر" میرے نزدیک وطن، جمہوریت، آزادی رائے اور بالآخر انسانیت، سب سے ایک قسم کی غداری ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مارچ ۱۹۹۸ء کے شمارہ میں میں نے "معروضات" کے تحت یہ عرض کیا تھا کہ "کم از کم ہندو احیاء پسندی کی تحریکوں کے ذمہ دار حضرات سے گفتگو کا وقت قریب آرہا ہے" (صفحہ ۲۳۲) چنانچہ آج وہ وقت آچکا اور ستمبر ۲۰۰۱ء سے بات چیت کا آغاز ہو چکا۔ اپریل ۲۰۰۲ء تک اس سعی و جہد کا ایک موڑ یہ آیا ہے کہ میرا تمام زور اس بات پر ہے کہ جناب کے۔ ایس۔ سُدرشن (SUDARHSAN) صاحب اور مسلم علماء/ مفکرین کے مابین اب بات چیت ہونا فوری طور پر اشد ضروری ہے۔ جس کے لئے اپنے خط مورخہ ۱۸ اپریل کو میں نے سُدرشن صاحب سے قطعی اور واضح جواب مانگا ہے[1]

[1] سدرشن صاحب کے مورخہ ۲۹ مارچ ۲۰۰۲ء کے جواب میں میرا نہایت تفصیلی خط ان کو جا چکا ہے۔

مورخہ ۶ اکتوبر کو عالی جناب سید محمد رابع حسنی صاحب مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور امیر جماعت اسلامی ہند کو میں نے جو خدشہ ظاہر کیا تھا وہ سامنے آگیا۔ مورخہ ۱۴ اکتوبر کو جناب رابع صاحب کا جواب موصول ہوا جس میں انہوں نے "تحریک پیام انسانیت" کا ذکر فرمایا۔ میں نے ۱۸ اپریل والے خط میں جو بنام سُدرشن صاحب ہے تحریکِ مذکورہ سے ان کو روشناس کراتے ہوئے وہ پمفلٹ بھیج دیا ہے جس میں اس کے خد و خال بیان کئے گئے ہیں۔ میرے پاس ابھی تک امیر جماعت اسلامی ہند کی جانب سے کوئی مراسلہ نہیں ملا۔

گجرات کے واقعات کے بعد اب جو خطوط ان حضرات کی خدمت میں پیش کئے گئے ہیں اس کی نقل اس کھلے خط کے ساتھ اور ان انگریزی تحریروں کے ساتھ آپ کو بھیج رہا ہوں جو اس سے منسلک ہیں۔

سابق میں "کارگل" کی جنگ کے واقعہ سے ۲۲ دسمبر ۲۰۰۱ء تک جو کچھ عزت مآب وزیر اعظم کو لکھا گیا وہ اس بات کے لئے کافی ہے کہ اس پر رائے عامہ لے لی جائے اور ان سے پوچھا جائے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ میری اس اپیل کو دفن کر دیا گیا (جس کی نقل اس خط سے منسلک ہے) کہ وہ خود عوام کے سامنے "سری اروبندو" "سوامی وویکانند" اور "اچاریہ شری رام شرما" کی وہ باتیں جلد از جلد سامنے لے آئیں جو اپیل میں موجود ہیں اور ملک میں امن، باہمی رواداری اور باہمی خیر اندیشی کی ضامن ہیں۔ حالات کے پیشِ نظر مجھے اب اس کھلے خط میں چند باتیں آپ سے صراحت سے عرض کرنا ہیں۔

(۱) آر ایس ایس کے تصور "ہندو راشٹر" اور تصور "کلچرل نیشنل ازم"[1] کو میں نے

[1] یہ دونوں بنیادی تصورات "ہندتو" سے مستعار ہیں اور "ہندتو" انسانی تاریخ کے ارتقائی عمل کی نفی ہے۔

سری اروبندو کے تصورات اور خود اپنی تھیوری کی روشنی میں (جس کا ماخذ علم الاقوام اور جدید فلسفۂ طبعیات کے دوررس نتائج ہیں) بالکل کالعدم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس فلسفۂ تاریخ کو میں نے قرآن سے اخذ کیا ہے اس کی روشنی میں نہ تو "ہندو برادرہڈ" نہ "مسلم برادرہڈ" اور نہ کسی ایسے "دیگر" برادرہڈ" کی کوئی گنجایش ہے جو انسانی برادرہڈ کو نسلی، قومی، وطنی، مذہبی اور کلچرل تعصبات کی آگ میں جھونکتا چلا جا رہا ہے۔

(۲) "ہندوتو" کے تصور یا تصورات کے لئے ویدانت اور ہندو دھرم کی تعلیمات میں کوئی گنجایش نہیں ہے، یہ ایک دوسرے کی مطلق نفی ہیں۔ اس پر میرا تفصیلی مضمون مستقبل قریب میں انگریزی میں شائع ہونے جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں آپ فی الوقت اس انگریزی تحریر کو دیکھ لیجئے جس میں یہ بات الگ الگ نکات کے تحت کہی گئی ہے۔

(تحریر منسلک ہے)

(۳) میں ذاتی طور پر شری رام اور سری کرشن کا ازحد احترام کرتا ہوں اور ہندو دھرم کی خوبیوں، اس کی وسعت اور اس کی ان تعلیمات کو اپناتا ہوں جو دلوں کو ملاتی ہیں، نفرت کو ختم کرتی ہیں اور آدمی کو انسان بننے کی طرف لے جاتی ہیں۔

(۴) مسلمان کو اس مذکورہ حقیقت کو اچھی طرح سمجھنا ہوگا۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ ایک طرف تو شریعت رسولؐ سے وہ انس ہے کہ اس کا ہر بیان ناکافی ہوتا ہے اور دوسری طرف مزاج رسولؐ سے وہ برگشتگی کہ اندھا دھند شدت پسندی، تفرقہ انگیزی، نہایت سخت لہجہ، برافروختگی، وہ بھی بے پناہ، توہین آمیز باتیں، احمقانہ خردہ گیری، ہندو عیسائی۔ یہودی تو ایک طرف خود ایک دوسرے کے لئے "کافر" کے لفظ کا استعمال غرض کہ اگر "کسی بت کدے میں بیان کروں تو صنم بھی کہے کہ ہری ہری"۔

(۵) اس وقت جو اس ملک میں بربریت کا ننگا ناچ ہو رہا ہے اور جو دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوبی" کر رہا ہے اس کی ہر صدا یہ بتا رہی ہے کہ اب یہاں جمہوریت اور آمریت اور انسانیت اور بہیمیت کے درمیان ایک فیصلہ کن معرکہ ہونے والا ہے جو نہ جانے کب تک کے لئے اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کر دے گا۔ چنانچہ اس وقت اگر سمجھ دار لوگوں نے مذہبی تعصبات کو ختم نہیں کیا، سیاسی افراتفری کو نہیں چھوڑا اور ایک عالمی نقطۂ نظر نہیں اپنایا تو مستقبل قریب میں وہ یہاں ایک عضو معطل ہو کر رہ جائیں گے۔

(۶) میں نے سدرشن صاحب کو نہایت صراحت سے لکھا ہے کہ "ہندوتو" اور ہندو دھرم ایک دوسرے کو کالعدم کر رہے ہیں۔ جہاں تک مسلمان کا معاملہ ہے اس کو اپنے اندر ایک ایسی مزاجی تبدیلی لانا ہوگی جو اس کو TOLERANCE کے بجائے ACCEPTANCE سکھائے۔ اگر وہ اسے نہ سمجھا تو پھر آگے اندھا کنواں ہے۔

(۷) نفرت کے اس عفریت کو اگر اب ختم نہ کیا گیا تو جلد سے جلد یہ ہر اس شخص کو ختم کرنے جا رہا ہے جو امن پسندی، محبت، رواداری، خیر اندیشی، قومی ایکتا اور اسی قسم کی باتیں کر رہا ہے۔

میں نے آپ سے جو کچھ عرض کیا اس پر غور فرمالیجئے اور اس سلسلے میں جو بات مناسب ہو اس کو منظر عام پر لائیے۔

میری یہ آواز اگر اسی طرح صدا بصحرا ہو گئی جس طرح ۱۹۶۹ء سے اب تک ہوئی ہے تو شاید یہ میری آخری آواز ہے۔ میری جانب سے ہر "کافر" گر ہر شدت پسند

اور ہر منفی موقف (NEGATIVE APPROACH) رکھنے والے مسلمان سے صرف اتنا کہنا ہے کہ "ھذا فراق بینی و بینک" اور ہر ہندو شدت پسند اور فرقہ پرست سے یہ کہنا ہے کہ وہ شری رام اور سری کرشن کی توہین کرنا بند کردے۔ یہ ہندو دھرم سے غداری ہے۔ وطن کی سالمیت کو ایک چیلنج ہے اور اس کی آبرو پر داغ ہے۔ وہ اچھی طرح یہ سمجھ لے کہ دیر یا سویر اس کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ "ہندتو" چاہتا ہے یا ہندو دھرم ؟

والسلام

احقر : معزز علی بیگ

دارالمصنفین کے مکاتیب کا سٹ

دارالمصنفین نے مکاتیب کے جو مجموعے شائع کیے ہیں۔ ان کو ملک و بیرون ملک کے علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان خطوط سے انیسویں صدی عیسوی کے آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے علمی، تعلیمی، ادبی، معاشرتی، اجتماعی اور سیاسی حالات کا مرقع سامنے آجاتا ہے۔

۱۔ مکاتیب شبلی اول مرتبہ علامہ سید سلیمان ندویؒ قیمت ۴۰ روپے
۲۔ " " دوم " " ۳۵ روپے
۳۔ بریدِ فرنگ " " " ۳۵ روپے
۴۔ مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ ادارہ
قیمت ۴۵ روپے۔

وفیات

ڈاکٹر ضیاالدین ڈیسائی مرحوم

از ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ٭

۲۴ مارچ ۲۰۰۲ء کو آثار قدیمہ و علم کتبات کے ماہر اور مرکزی حکومت کے ادارے برائے کتبہ شناسی ناگ پور کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے ۷۷ سال کی عمر میں احمد آباد میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

وہ کئی ماہ سے علیل اور احمد آباد کے ایک اسپتال میں داخل تھے ان کی وفات کی اطلاع اس لئے تاخیر سے ملی کہ ان دنوں احمد آباد بلکہ گجرات میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی جس میں ہزاروں انسان زندہ جلادئے گئے اور لاکھوں بے خانماں اور برباد ہوکر اپنے ہی وطن میں بے وطن ہوکر رہ گئے۔ خود ڈیسائی صاحب مرحوم کے صاحب زادے کی دوا کی دکان بھی شرپسندوں نے جلادی تھی، چنانچہ اس ہولناک قتل عام کی وجہ سے اور خبریں دب گئیں اور ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کے حادثۂ انتقال کی خبر بھی نہ لگ سکی اور وہ کرفیو کے دوران سپرد خاک کردئے گئے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم احمد آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۸ مئی ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم بمبئی میں ہوئی، تحصیل علم کے بعد وہ درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے کچھ دنوں تک اسمٰعیل یوسف کالج بمبئی اور دھرمندر سنگھ جی کالج راج کوٹ سے بطور لکچرر

٭ ہراج پور۔ الور گنج، اعظم گڈھ ۲۷۶۰۰۱۔

وابستہ رہے۔ ۱۹۵۳ء میں آرکیالوجیکل سوسائٹی آف انڈیا ناگ پور کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ برائے کتبات مقرر ہوئے پھر سپرنٹنڈنٹ ہوئے اور آخر میں ترقی کر کے ڈائریکٹر برائے کتبات کے عہدہ پر فائز ہوئے اور اسی عہدہ سے ۱۹۸۰ء میں سبکدوش بھی ہوئے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم ملک کے ممتاز عالم و محقق تھے۔ تاریخ و آثار اور کتبات ان کا خاص موضوع تھا، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ فارسی زبان و ادب میں بھی صاحب کمال تھے، لیکن ان کا امتیازی وصف کتبہ شناسی تھا جس میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا، ان کی اس مہارت کا اعتراف ملک نے بھی کیا اور ماہر کتبات کی حیثیت سے انہوں نے بین الاقوامی شہرت بھی حاصل کی۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم تصنیف و تالیف کا عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ اپنے موضوع پر انہوں نے کئی اہم اور معرکۃ آرا کتابیں انگریزی میں لکھیں، ان کی ایک کتاب "ایپی گرافیا انڈیکا آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا" ہے، جسے ۱۹۶۷ء میں منیجر پبلی کیشنز دہلی نے شائع کیا۔ یہ دراصل مجموعہ مقالات ہے جس کو ڈیسائی صاحب نے مرتب کر کے شائع کیا ہے، دوسرے اہل قلم کے مقالات کے علاوہ اس میں ڈیسائی صاحب کے تین قیمتی اور گراں قدر مقالات شامل ہیں، ایک مقالہ میں رضیہ سلطانہ کے عہد کے کتبات کا ذکر ہے، دوسرے میں مملوک سلاطین کے عہد کے کتبات کا ذکر ہے، جب کہ تیسرے مقالہ میں غیاث الدین تغلق کے عہد کے کتبات کی تفصیل ہے۔ یہ کتبات اترپردیش کے مختلف اضلاع و قصبات سے دریافت ہوئے تھے، ان میں مہوبہ اور ظفرآباد وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دوسری کتاب "ایپی گرافیا انڈیکا عربک اینڈ پرشین" ہے جس میں عربی و فارسی کے کتبات کو موضوع تحقیق بنایا گیا ہے۔ تیسری کتاب "ملفوظات: ایز اے سورس آف پالیٹکل ہسٹری

اینڈ کلچرل ہسٹری آف گجرات اینڈ راجستھان" ہے۔ یہ کتاب ان کا ایک بڑا تحقیقی کارنامہ ہے، اس میں انہوں نے گجرات اور راجستھان کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کے ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت سے ادب کا جائزہ لیا ہے اور ادب کو تاریخ کے ایک ماخذ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

ایک کتاب ہند اسلامی طرز تعمیر ہے جسے پبلی کیشنز ڈویژن نے شائع کیا ہے۔ اسی ادارہ نے ان کی ایک اور کتاب "ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز" بھی شائع کی ہے، ان دونوں کتابوں کو علی الترتیب اختر الواسع اور بہار برنی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے، اس سلسلہ کی ان کی ایک گراں قدر تصنیف "ہندوستان کی مسجدیں" بھی ہے اور اسے بھی پبلی کیشنز ڈویژن ہی نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔ اس میں اولاً اسلام میں مسجد کے مقام و مرتبہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے آغاز و ارتقا، ہندوستان میں مساجد کی تعمیر، اولین مساجد اور طرز تعمیر وغیرہ کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف صوبوں مثلاً بنگال، جون پور، گجرات، مالوہ، دکن اور کشمیر وغیرہ کی مساجد اور ان کے طرز تعمیر کا عہد وار جائزہ پیش کیا ہے، چند منفرد اور ممتاز مساجد کی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر عمدہ کاوش قرار دی جاتی ہے اور بلاشبہ یہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ایک بڑا اور قابل قدر کارنامہ ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے متعدد اہم مقالات بھی سپرد قلم کئے جو مجلہ انڈو ایرانیکا وغیرہ موقر علمی رسائل میں شائع ہوئے، انڈو ایران سوسائٹی اور کئی دوسری علمی انجمنوں کے وہ ممتاز رکن رہے، علماء و محققین سے بڑا تعلق رکھتے تھے، دارالمصنفین سے ان کو عشق تھا، معارف کے بڑے قدرداں تھے۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب مرحوم سے

ان کے مخلصانہ روابط تھے، موجودہ مدیر معارف سے بھی محبت کرتے تھے۔

علم و تحقیق کی دنیا میں اور خاص طور سے کتبہ شناسی کے میدان میں ان کی کمی برسوں محسوس کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!!

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر، آل انڈیا ملی کونسل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے بانی اور جنرل سکریٹری، امارت شرعیہ بہار، اڈیسہ اور جھارکھنڈ کے قاضی القضاۃ و نائب امیر شریعت اور ملک و بیرون ملک کے متعدد علمی و تعلیمی اور مذہبی اداروں کے رکن مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب ۴ اپریل ۲۰۰۲ء کو وفات پاگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اس قحط الرجال اور پرآشوب دور میں جب امت مسلمہ پر ہر طرف سے یلغار ہورہی ہے، اس کی مشکلات اور دشواریاں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں اور اس کے مسائل کی پیچیدگی اور الجھاؤ میں برابر اضافہ ہورہا ہے، قاضی صاحب جیسے راہبر و مجاہد کا اسے چھوڑ کر چلا جانا اس کی کتنی بڑی بدنصیبی ہے ؎ آج شبیر پر کیا عالم تنہائی ہے + ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے۔
ابھی انکی عمر زیادہ نہیں تھی اور طوفان حوادث میں گھری ہوئی ان کی قوم و ملت کو ان کی سخت ضرورت تھی، مگر مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ہولناک سناٹے میں جب نہ کہیں بوئے دم ساز اور کوئی آواز آتی ہے کون حریف مے مرد افگن عشق ہوگا۔

وہ ضلع دربھنگہ (بہار) کے قصبہ جالہ میں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے تھے، اسلامی عہد میں ان کا خاندان عہدۂ قضا پر فائز تھا، ان کے والد بزرگوار مولانا عبدالاحد صاحب ممتاز عالم دین اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر

ہوئی، اپنے ضلع کے بعض مدارس میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے دارالعلوم مئو میں داخلہ لیا، ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم دیوبند پہنچے اور اس وقت کے اکابر علما سے کسب فیض کیا، ۱۹۵۵ء میں وہاں سے فراغت کے بعد جامعہ رحمانی مونگیر میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے لگے۔

مولانا منت اللہ صاحب نے ہونہار دیکھ کر انہیں اپنی تربیت میں لے لیا اور ۱۹۶۲ء میں پھلواری شریف لے آئے اور امارت شرعیہ کے کاموں میں لگادیا۔ یہاں ان کی صلاحیتوں کے جوہر خوب چمکے اور انہوں نے اس کے پلیٹ فارم سے خدمت خلق، اصلاح معاشرت، مسلمانوں کے تحفظ وغیرہ کے گوناگوں قومی و ملی کام انجام دئے اور اپنی زندگی دین و علم کی اشاعت اور قومی و ملی و اصلاحی خدمت کے لئے وقف کردی۔ پہلے شعبۂ قضا کا نظام سنبھالا اور اسے بڑی وسعت و ترقی دی، مختلف جگہوں پر دارالقضا قائم کئے، گاؤں گاؤں کا دورہ کرکے مکاتب کے جال بچھائے، باہمی نزاعات کا تصفیہ کیا، فساد زدہ علاقوں میں جاکر ریلیف کا کام کیا، مظلوموں اور آفت رسیدہ لوگوں کی مالی، اخلاقی، سیاسی اور قانونی مدد کی، امارت سے ان کا تعلق مدۃ العمر رہا اور قاضی القضاۃ اور نائب امیر شریعت جیسے اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔

قاضی صاحب کی تحریک سے مولانا سجاد ہسپتال امارت کے زیر نگرانی قائم ہوا۔ جس سے غریب لوگوں کو طبی سہولتیں میسر آرہی ہیں۔ انہوں نے قضا کے نظام کو بہتر اور موثر بنانے اور مناسب افراد تیار کرنے کے لئے امارت شرعیہ کے زیر اہتمام "المعہد العالی لتدریب القضاء والافتاء" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو اب تربیت قضا و افتا کے لئے پورے ملک میں مشہور ہے۔

اسی سلسلے میں اسلامک فقہ اکیڈمی کی تشکیل کا خیال بھی ان کے ذہن میں آیا جس کے بہت اعلیٰ پیمانے پر نہایت کامیاب بیسیوں سمینار ان کی سرکردگی میں ہوئے جن کے کئی جلدوں پر مشتمل مجلات شائع ہوئے ۔ قاضی صاحب نے اس کے ذریعہ مدارس وغیرہ میں فقہ و افتا کی خدمت پر مامور علما و مفتیان کو ان کے زاویوں سے نکال کر نئے پیش آمدہ مسائل کا حل ڈھونڈنے اور فقہی مقالات لکھنے پر آمادہ کیا۔ مدارس کے ہونہار طلبہ و فضلا کو بھی اس طرح کے کام کرنے کی امنگ بخشی، اس طرح علمی و فقہی مباحث پر لکھنے والے نوجوانوں کی ایک جماعت تیار کردی۔

قاضی صاحب کے خاص مربی مولانا منت اللہ رحمانی کی کوششوں سے ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسا باوقار ادارہ وجود میں آیا، جس کی تشکیل کے وقت ہی سے قاضی صاحب ان کے دست راست کی حیثیت سے اس کی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے، وہ شروع سے بورڈ کے تاسیسی اور مجلس عاملہ کے رکن رہے، شاہ بانو کیس کا معاملہ گرم ہوا تو مسلم پرسنل لا بورڈ کے نقطہ نظر کی وضاحت اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے انہوں نے ملک کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا، مسلم پرسنل لا کے تمام گوشوں اور نکات پر ان کی جیسی نظر کسی کی نہ تھی اور قدرت نے گویائی اور تعبیر و بیان کا جو ملکہ انہیں عطا کیا تھا وہ بھی دوسروں میں مفقود تھا، اس لئے بورڈ کے پہلے صدر مولانا قاری محمد طیب صاحب اور دوسرے صدر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے زمانے میں وہ بورڈ کے وکیل اور سفیر بن کر اس کی نہایت کامیاب ترجمانی کرتے رہے۔ قاضی صاحب کی قابل رشک صلاحیتوں اور شاندار خدمات ہی کی بنا پر بورڈ کے تیسرے صدر کی حیثیت سے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ لیکن انہیں کم موقع ملا اور وہ مسلسل موذی امراض میں مبتلا رہے۔ تاہم بورڈ کو موثر اور

فعال بنانے پر پوری توجہ کی اس کے مرکزی دفتر کو اپ ٹو ڈیٹ بنایا اور عصری سہولتوں سے آراستہ کیا، اس کی لائبریری قائم کی، مسلم پرسنل لا سے متعلق فقہی و قانونی کتابیں اور دستاویز جمع کیے، فقہی موسوعہ شائع کرایا۔

۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر سید محمود کی مساعی جمیلہ سے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا، جس کی اٹھان بہت شاندار تھی، مگر ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہی میں وہ اختلافات و تعطل کا شکار ہوگئی اور اب تو اس کے ٹکڑے بھی ہوگئے ہیں، قاضی صاحب جیسے فعال اور متحرک شخص نے یہ صورت حال دیکھ کر ۱۹۹۲ء میں آل انڈیا ملی کونسل قائم کی، کونسل کی اصل توجہ ملی اتحاد و اشتراک اور مسلمانوں کے انتشار اور پراگندگی دور کرنے کی جانب رہی، اس نے دینی و عصری تعلیم اور سیاسی و مذہبی مسائل کو بھی اپنے ہاتھ میں لیا مگر ملی کونسل کو مسلم مجلس مشاورت جیسا مشترکہ اور باوقار پلیٹ فارم بنانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔

قاضی صاحب دینی تعلیم کا معیار بہتر بنانے، اس کے نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح و ترقی، مدارس کے تحفظ اور انہیں حکومت کی یورش سے بچانے کے لئے برابر فکر مند رہتے تھے، بہار و اڑیسہ کے متعدد مدارس کے وہ سرپرست تھے۔ مولانا منت اللہ رحمانی کی سربراہی میں غیر سرکاری مدارس کے نصاب و نظام تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور ان کا معیار بلند کرنے کے لئے آزاد دینی مدارس بورڈ قائم ہوا تو قاضی صاحب نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ان کی کوشش سے مدارس اسلامیہ کونسل کا قیام عمل میں آیا، وہ وفاق المدارس الاسلامیہ کے صدر بھی تھے۔

دینی اور عصری تعلیم کے فروغ کی جانب بھی ان کی توجہ رہی، اپنے وطن جالہ میں ایک ایجوکیشنل کیمپس قائم کیا جس میں پرائمری اسکول سے ڈگری کالج اور ٹیچرس ٹریننگ کالج تک ہر سطح کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہتے تھے، اس وقت ایک اقامتی انگلش میڈیم ہائی اسکول وہاں چل رہا

ہے، امارت شرعیہ کے زیر انتظام اس کے مرکز اور بعض دوسرے اضلاع میں جو ٹیکنیکل ادارے قائم ہوئے ان کے قیام اور ان کے لئے وسائل و ذرائع کی فراہمی میں انہوں نے بڑی دلچسپی لی۔ ان میں خطابت اور تقریر کا ملکہ خداداد تھا، اس میں وہ دوسروں سے علانیہ ممتاز تھے، وہ اپنی موثر اور دل نشیں تقریروں سے مجمع کا رخ موڑ دیتے تھے، اگر انتشار کی کیفیت ہوتی یا مذاکروں اور مباحثوں میں اختلاف ناگواری کی صورت اختیار کر لیتا تو وہ اپنی خداداد صلاحیت سے اسے صحیح رُخ پر لانے میں کامیاب ہوجاتے، قاضی صاحب کی تقریروں میں بڑی بے ساختگی روانی اور سراپا آمد ہوتی، آورد اور تصنع کا نام بھی نہ ہوتا، جو بات کہتے حسب حال اور حسب موقع ہوتی، الفاظ کے استعمال اور موضوع کے انتخاب میں مجمع اور مخاطب کی رعایت ملحوظ رکھتے، ان کی تڑپ، دردمندی اور سوز وگداز کی بنا پر ان کی تقریریں جادو کا کام کرتی تھیں۔

فقہ و افتا کے ماہر اور دین و شریعت کے مزاج شناس تھے لیکن دوسرے تمام علوم دینیہ بھی ان کی دسترس میں تھے اور سب پر نہایت خود اعتمادی سے گفتگو کرتے تھے، انہوں نے ہر علم و فن کی تحصیل دیدہ ریزی سے کی تھی، ان کا مطالعہ وسیع اور علم مستحضر تھا، عام علماء و مدرسین کی طرح وہ صرف درسی اور مذہبی کتابوں ہی سے اشتغال نہیں رکھتے تھے بلکہ جدید خیالات و رجحانات سے بھی باخبر تھے۔ اسلام پر مستشرقین کے اعتراضات سے واقف تھے، اسلامی تاریخ کو انگریز اور ہندو مورخین نے مجروح کرنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ ان کی نگاہ میں تھیں اور موقع بہ موقع ان کا جواب بھی دیتے تھے۔

اسلام کی طرح دوسرے مذاہب و افکار اور نظریات کا بھی انہوں نے مطالعہ کیا تھا انگریزی زبان اور جدید علوم سے بھی واقف تھے، جب ان پر گفتگو کرتے تو ان علوم کے ماہرین کو حیرت زدہ کر دیتے، پریس کانفرنس میں اپنی ذہانت، حاضر جوابی، منطقیانہ استدلال

اور تجزیہ و تنقیح سے صحافیوں کو عاجز کر دیتے، بین الاقوامی حالات و مسائل، سیاسی تبدیلیوں اور مدوجزر پر گہری نظر رکھتے تھے۔

قاضی صاحب کا اصل ذوق علمی و تحقیقی تھا، تصنیف و تالیف کی صلاحیت ان میں بدرجۂ اتم تھی مگر ان کے کاموں کا دائرہ بہت وسیع اور پھیلا ہوا تھا، بہ کثرت سفر کرنا پڑتا تھا اس لیے جم کر اور یک سوئی کے ساتھ انہیں تصنیف و تالیف کا موقع نہیں ملتا تھا، تاہم انہوں نے متعدد عالمانہ تصانیف اور محققانہ حواشی اردو اور عربی میں لکھ کر اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے، بعض فتاویٰ کے مجموعوں پر تعلیقات بھی قلم بند کی ہیں، ان کی ادارت میں نکلنے والا سہ ماہی بحث و نظر ان کی تحریری صلاحیت، فقہی بصیرت اور علمی دقت نظر کا غماز ہے۔

قاضی صاحب بڑے اعتدال پسند تھے، وہ تصادم اور ٹکراؤ سے بچ کر اتحاد و اشتراک کا راستہ اختیار کرتے تھے، وہ مختلف الخیال افراد اور جماعتوں کو ساتھ لے کر چلنے کے عادی تھے، ان میں سب کو جوڑے رکھنے اور مطمئن کر دینے کی صلاحیت تھی، کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتے، وہ جماعتی عصبیت اور تنگ نظری سے دور رہتے تھے ان میں یہ وسعت نظر تھی کہ حنفی مذہب کے جو مسائل اس زمانے سے ہم آہنگ نہیں ہیں یا ناقابل عمل ہو گئے ہیں، ان میں دوسرے مذاہب کو اختیار کرنے میں قباحت نہیں محسوس کرتے تھے، وہ نہ تقلید جامد کے قائل تھے اور نہ اجتہاد کا دروازہ مسدود سمجھتے تھے۔ مختلف فیہا اور نئے پیش آمدہ مسائل میں اہل علم و اصحاب افتا سے مشورے اور تبادلہ خیال کے بعد اجتماعی رائے سے فتویٰ دیتے تھے، جس پر بعض جامد قسم کے لوگ معترض بھی ہوتے تھے، مگر عام طور سے ان کی اس فکری و ذہنی کشادگی کو پسند کیا جاتا تھا اور موافق و مخالف ہر ایک ان کی علمی و فقہی بصیرت کا اعتراف کرتا تھا۔ قاضی صاحب نے اپنے مجتہدانہ ذوق سے فقہ اکیڈمی تشکیل کر کے فقہی جمود کو توڑنے کی جو کوشش کی وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ گزشتہ برس انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز

دہلی نے تفقہ و اجتہاد میں ان کے کمال کا اعتراف کرکے انہیں شاہ ولی اللہ ایوارڈ دیا تھا۔

قاضی صاحب کی ایک نمایاں خوبی ان کی معاملہ فہمی ہے، وہ بہت جلد مسائل کی تہ تک پہنچ جاتے تھے، اس کی وجہ سے انہیں استنباط و استخراج اور نتائج اخذ کرنے میں بڑی آسانی ہوتی تھی، علمی و فقہی مسائل کی طرح تجارتی اور معاشرتی نیز ہر قسم کے معاملات کی گہرائی تک پہنچ کر ان میں اختلاف و نزاع کا تصفیہ کر دیتے تھے۔

قاضی صاحب کی علمی عظمت، انتظامی صلاحیت اور فقہی تبحر کی شہرت ملک و بیرون ملک میں تھی مختلف اداروں اور تنظیموں سے ان کا تعلق تھا، متعدد کمیٹیوں اور اداروں کے وہ ممبر تھے، ہندوستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ وہ پاکستان، بنگلہ دیش، ملیشیا، عرب امارات، مصر، سعودی عرب، امریکہ، برطانیہ اور جنوبی افریقہ وغیرہ کے اجتماعات میں تقریریں کرتے اور کانفرنسوں میں مقالات پڑھتے۔

قاضی صاحب بڑے متواضع اور خاکسار تھے، ان میں کبر و نخوت اور عجب و پندار نہ تھا، انہوں نے دردمند دل پایا تھا اور وہ بڑے نرم گفتار اور نرم دل تھے، ان کی زندگی دینی و ملی کاموں کے لئے وقف تھی، ہر شخص کا کام کرنے کے لئے تیار رہتے، سب سے گرم جوشی اور خندہ پیشانی سے ملتے، میں نے کبھی انہیں غصے اور طیش میں یا کسی پر برہم ہوتے نہیں دیکھا، ان پر نکتہ چینی کی جاتی تو اس سے ان کی پیشانی پر شکن نہ پڑتی، اعتراض و اختلاف سے وہ نہ گھبراتے تھے اور نہ آزردہ ہوتے تھے۔ غرض ایک میر کارواں کے لئے جو رخت سفر درکار ہوتا ہے یعنی نگہ بلند، سخن دلنواز اور جان پرسوز، وہ ان کے پاس مہیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور مسلمانوں کو ان کا بدل نصیب کرے۔ آمین!!

والی آسی

۱۴/اپریل کو اردو کے ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر والی آسی کا انتقال ہوگیا، انہیں شاعری اور اردو زبان کی خدمت کا ولولہ اپنے نامور والد مولانا عبدالباری آسی مرحوم سے وراثت میں ملا تھا۔

والی مرحوم کی تعلیم ممتاز اسکول اور امیرالدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ میں ہوئی تھی، جناب ساجد لکھنوی سے ان کی دوستی تھی، دونوں نے لاٹوش روڈ پر مکتبہ دین و دنیا قائم کیا، جہاں سے متعدد مجموعے شائع کئے، دونوں نے مل کر نعتیہ کلام کا ایک مجموعہ "ارمغانِ نعت" کے نام سے مرتب کرکے شائع کیا تھا، جو بہت مقبول ہوا۔

والی مرحوم شریف، ملنسار مگر خوددار شخص تھے، صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، ان کی شاعری فکر و خیال کی طہارت اور اسلامی رنگ کی حامل ہوتی تھی، ان کے دو مجموعے "شہد" اور "موم" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، رسالوں میں بھی ان کا کلام چھپتا رہتا تھا، مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے، ان کا ترنم بہت اچھا تھا مگر اکثر تحت اللفظ پڑھتے تھے، آواز اتنی پاٹ دار ہوتی تھی کہ سامعین خود بخود متوجہ ہو جاتے تھے، اپنے جان دار کلام کی وجہ سے ملک کے علاوہ دوحہ، قطر، مسقط، جدہ، دبئی، لندن اور نیویارک کے مشاعروں میں بھی مدعو کئے جاتے تھے، ان کے شاگردوں کا وسیع حلقہ تھا، جن میں مشہور شاعر منور رانا بھی ہیں، وہ بڑے یارباش تھے، امین آباد میں ان کی دکان پر دوست شاعروں کا جمگھٹ رہتا تھا۔

ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، جو آزادی کے پچاس برس گزرنے کی مناسبت سے کہے گئے ہیں:

کبھی کیا نہ کسی سے بیاں پچاس برس — کہ ہم نے کیسے گزارے یہاں پچاس برس
یہ چاہتے تھے قصیدہ ترا لکھیں لیکن — لہو میں ڈوبی رہیں انگلیاں پچاس برس
درخت کٹتے گئے اور سر بھی کٹتے گئے — مگر کھلی نہ کسی کی زباں پچاس برس
خود اپنی جان بچانے کی فکر ہی میں رہے — ڈرے ڈرے سے مرے پاسباں پچاس برس

اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اعزہ کو صبر جمیل مرحمت فرمائے۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

وفیات مشاہیر اردو از جناب بشارت علی خاں فروغ، متوسط تقطیع کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۲۷۲، قیمت -/۴۰ روپے، پتہ: بشارت علی ایڈوکیٹ، محلہ شاہ آباد گیٹ، رام پور، یوپی اور مکتبہ الحسنات، رامپور۔

مشاہیر کی ولادت و وفات، حالات و تصنیفات کا مختصر مگر جامع اشاریہ بڑا اہم اور مفید ہوتا ہے۔ اردو تذکرہ نویسی میں ایسی متعدد کاوشیں پہلے سے موجود ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں حروف تہجی کے لحاظ سے اردو زبان کی قریب پچیس سو شخصیتوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان میں مشاہیر کے ساتھ متعدد غیر معروف نام بھی ہیں جن کے متعلق ضروری معلومات کا حصول مشکل تھا لیکن فاضل مولف کی قابل قدر محنت و کاوش سے ان کے نام و کام سے واقفیت آسان ہوگئی۔ مصادر و مآخذ تک رسائی کے باوجود اس پر مشقت کام میں اب بھی کئی مقامات توجہ طلب ہیں، مثلاً مذکور اشخاص کی ولدیت میں ترتیب کی خامی جیسے ابن انشا کے نام کے بعد شاعر انشا پرداز، ادیب، مزاح نگار کے اوصاف کے بعد بن چودھری منشی خان لکھا گیا ہے۔ ابن انشا بن چودھری منشی خاں لکھنا بہتر ہوتا۔ اوصاف کے بیان میں شاعر، عالم وغیرہ کے ساتھ سید بھی لکھا گیا ہے۔ مولانا تھانوی کی کتابوں میں سید قطب شہید کا شمار غلط ہے۔ الیاس کاندھلوی کے نام سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ بانی جماعت تبلیغ ہیں یا کوئی اور، گلبرگہ کو میسور اور ناندیڑ کو دکن میں شامل کیا گیا ہے حالانکہ

اب اول الذکر کرناٹک کا اور موخر الذکر مہاراشٹر کا حصہ ہوگیا ہے۔ .... مولانا امین احسن اصلاحی کا مولد بجائے بمہور کے بمور لکھا گیا، انجان تخلص مذکور ہے، نام کی صراحت ضروری تھی۔ شاہ بدرالدینؒ کے متعلق صرف سجادہ نشین کافی نہیں، خانقاہ مجیبیہ کی نسبت ضروری تھی۔ جگر مرادآبادی کے اساتذہ میں منشی امیر اللہ تسلیم کا نام ہے جو درست نہیں۔ منشی صاحب کے انتقال کے وقت جگر کی عمر بمشکل دس گیارہ سال کی تھی۔ حامد نعمانی کے متعلق ادیب و محقق لکھنا بھی درست نہیں۔ اقبال سہیل کو صرف سہیل اعظم گڈھی لکھا گیا علامہ شبلی کی تصانیف میں سیرۃ النبی چھ جلد لکھنا بھی درست نہیں۔ کنتور ضلع فیض آباد میں نہیں بارہ بنکی میں ہے۔ ارض القرآن مولانا دریابادی کی تصنیف نہیں۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات میں تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ تاریخ بھی شامل ہے؛ ماخذات کا لفظ درست نہیں، ان تسامحات کے علاوہ کمپیوٹر کی کتابت میں بھی غلطیاں جا بجا ہیں۔

دعوت اسلام اقوام عالم اور برادران وطن کے درمیان از جناب پروفیسر محسن عثمانی ندوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۰، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: یونیورسل پیس فاؤنڈیشن، عرفی اپارٹمنٹس 163/3-B، جوگابائی ایکسٹنشن، نئی دہلی۔

اسلام کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں حال کی ضرورتوں اور مستقبل کے امکانات اور تقاضوں پر ماضی کی روشنی میں ایک مفصل، سنجیدہ اور لائق عمل بحث اس کتاب کا موضوع ہے جس میں اولاً قرآن مجید و سیرت نبویؐ اور حیات صحابہ کرامؓ کو دعوت کی اساس کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ فرض عین و کفایہ کی تعیین سے قطع نظر اسلام کے پیام کی دعوت ہر مسلمان کا فریضہ ہے لیکن اس کار منصبی کی ادائیگی میں غفلت اور کوتاہی ہوئی ہے جس کا نتیجہ فاضل مصنف کے الفاظ میں

"کہیں آبرو اور راحت کی زندگی جسے قرآن میں حیات طیبہ کہا گیا ہے میسر نہیں" اسی احساس نے اس کتاب کی تالیف پر آمادہ کیا۔ فاضل مصنف ایک کامیاب معلم اور شگفتہ قلم اور صاحب فکر ادیب ہیں، دوسرے ادیان کا مطالعہ ان کا خاص موضوع ہے، ہندو مذہب، مطالعہ مذاہب، تبلیغ اسلام اور دین کا متوازن تصور کے نام سے ان کی کتابیں پہلے بھی شائع ہوچکی ہیں، زیر نظر کتاب کے مضامین بھی مختلف رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان تحریروں میں اسلام کے پیام توحید و انسانیت کی ضرورت اور کار دعوت کی نزاکت و رعایت و مصلحت کی حکیمانہ نشان دہی کی گئی ہے، خصوصاً ہندوستان میں اصول و طریق دعوت کی بحث بڑی کارآمد و مفید ہے، موجودہ حالات میں ایسی تحریروں کی خاص اہمیت اور ضرورت ہے۔ کتاب کی بڑی خوبی تحریر کی سلاست و شگفتگی ہے۔

نقش معنی از جناب ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت مجلد، صفحات ۲۳۲، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

زیر نظر کتاب مصنف کے چند منتخب ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ آبرو و مومن اور رشید حسن خاں اور قصیدہ و بلاغت کے علاوہ سب مضامین کا تعلق غالبیات سے ہے جن میں غالب کی معنویت، ان کی فارسی شاعری اور شمس الرحمن فاروقی و حنیف نقوی کی غالب شناسی پر اظہار خیال ہے، لیکن شروع کے دو مضامین جو قصیدہ و بلاغت سے تعلق رکھتے ہیں زیادہ اہم ہیں، ان میں عربی قصیدہ نگاری کے متعلق اس خیال کا ابطال ہے کہ فارسی و اردو کی طرح یہ عربی میں بھی ایک جدا صنف سخن ہے، مصنف کی نظر میں یہ ایسی ادبی اصطلاح ہے جو طوالت، حسن اور دلآویزی کا تصور رکھتی ہے رجز و قطعات اور

کبھی محض قطعات کے مقابل ہو کر صرف ایک صنف کی حدود سے ماوراء ہے بلکہ پوری عربی شاعری کا مصداق ہے، لیکن فارسی اردو قصیدہ نگاری کے خصوص اور عربی قصیدہ کے عموم کے باوصف یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ فارسی قصیدہ نگاری فرق بحر کے باوجود عربی قصائد کی ہی مقلد رہی، اسی بنیاد پر اگر اردو کے بعض ناقدین نے "قصیدہ کو عربی شاعری کی پیداوار یا عربی کی شہرہ آفاق صنف سخن یا عربوں کے شاعرانہ کمال کا مدار" کہا تو اسے مطلق غلط نہیں کہا جاسکتا، اسی طرح اغراض و ارکان و ابواب شعر کی ترجمانی اصناف سے کرنا بھی محل نظر ہے ایک جگہ (ص ۱۶) لکھا گیا کہ عربوں نے شاعری کو اصناف سخن میں تقسیم ہی نہیں کیا لیکن ص ۲۸ پر یہ عبارت بھی ہے کہ "عربی شاعری میں قدیم سے ہی متعدد اصناف موجود تھیں"۔ بلاغت کی صنعت ادماج و استطراد کی بحث دقت نظر اور وسعت مطالعہ کے علاوہ اس لحاظ سے بھی قابل ستائش ہے کہ کلاسیکی بنیاد پر مبنی ان مباحث پر موجودہ ناقدین ادب نے کم توجہ کی ہے یہ دراصل حالی و شبلی کی تنقیدی روایت کا احیاء ہے جو خوش آیند ہے باقی مضامین بھی اچھے ہیں، البتہ نقد کی شدت کی طرح مدح کے مبالغہ کا احساس بھی ہوتا ہے اور کہیں کہیں تو یہ مدل مداح کی معروف روایت سے جا ملتا ہے کتاب کا پہلا جملہ یعنی "یہ مضامین صلہ و ستایش سے بے نیاز ہو کر لکھے گئے ہیں۔ حرف زائد اور نقش بے معنی ہے۔

پھول کھلے ہیں رنگ برنگے از جناب شان الحق حقی قدرے چھوٹی تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت مجلد صفحات ۱۱۲ قیمت ۷۰ روپے پتہ: ہمدرد فاؤنڈیشن ہمدرد سنٹر، ناظم آباد کراچی

بچوں کے لئے ان کے ذہن، مزاج، مذاق، ماحول کی مناسبت سے ان کی زبان میں بامقصد نظموں اور گیتوں کا یہ مجموعہ جناب حقی کے حقیقت نگار ہونے کا ایک اور نمونہ ہے بچوں کے لئے ان نظموں میں مسرت اور افادیت ہے تو بڑوں کے لئے بھی یہ لطف و حظ سے خالی نہیں خصوصاً کہہ مکرنیاں، پہیلیاں وغیرہ اس لئے ۸ سے ۸۰ سال تک کے بچوں کے لئے اس مجموعہ کا دعویٰ محض شاعرانہ یا بچکانہ تعلی نہیں۔ ع-ص